لوح و قلم

چیلنج کا مقابلہ جرأت سے کیا جائے

بھٹو کا خط میر مرتضیٰ کے نام

دفتر رابطہ مطبوعات الفتح کراچی

...یس کراچی

قیمت ۵/ روپے

قارئین سمجھتے ہیں

از محاسبہ چہ باک؟

۱۱ مارچ ۱۹۷۹ء کے "جنگ" کراچی میں مسٹر جسٹس (ر) ٹیائرڈ ایم بی احمد کا ایک مضمون چھپا جس کی ایک سرخی ہے۔

"چو حساب پاک است از محاسبہ چہ باک است" فارسی کا یہ مقولہ تو محض جذباتی نعرہ ہے اور غیر منطقی غیر عملی، خالی نظریاتی اور بے بنیاد حیثیت کا حامل ہے ہاں البتہ عقبیٰ کے لئے کہیں تو پھر یہ صحیح ہے جہاں نہ انسانی پولیس ہے اور نہ انسانی عدالتیں، یہ لوگ تو ہیں تو اسفل السافلین میں جا داخل ہوتے ہیں (سورہ تین آیت ۵) نزدیک تر کتے ہی نہیں۔

یہ مقولہ کسی لحاظ سے بھی غیر مشروط طور پر اس دنیا بالخصوص اس مسلم بر اعظم کے بارے میں نہیں ہے جہاں سیکولرازم اور مذہب کا منافقانہ آمیزہ ہر معاملے میں بکمال فراڈ استعمال میں لے آیا جاتا ہے اگر مشرقی ممالک کی پولیس چاہے تو ایک اچھے بھلے متقی شخص کی جیب سے چرس یا گانجا برآمد کر کے اس کا ریمانڈ لے سکتی ہے اس وقت بھلا کون کہے گا "از محاسبہ چہ باک" وہ بے چارہ "سنگسار" ہو جائے گا۔

میں اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتا (وہ یوم حشر پر ملتوی کرتا ہوں) سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج اور اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جناب محمد افضل چیمہ کا ۲۵ اپریل ۱۹۷۸ء کو نیویارک میں بیان دیکھ لیجئے۔ "جنگ" کراچی مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۷۸ء سے موصوف کے بیان کے اقتباس پیش خدمت ہیں ان اقتباسات کو اور اسلام میں رحم کی گنجائش نہیں"، کہ مولویانہ اور چودھریانہ فراڈ اور غیر اسلامی نعروں کو دیکھیے اس ولایتی ڈاکٹر کا قول برحق نظر آنے لگے گا جو کہتا ہے کہ ہر ماہ دماغ کا معائنہ ہر شخص بالخصوص بیلک مین کے لئے ضروری ہو گیا ہے حضرت! یہ ہمارے لئے فرمایا گیا ہے! خدارا اپنا قومی تشخص سمجھئے ایسی غلیظ قومی صورتحال کو اسلامی قرار دینے والوں کو یا اس میں اسلام کے گیت گانے والوں کو کوڑے لگا کر سنگسار کر دینا چاہیئے وہ ان افیمیوں سے بھی زیادہ توہین آمیز اور ننگ اسلام ہیں جو اب افیم کے بغیر مر رہے ہیں۔

(۵) پاکستان میں رائج قانونی نظام ....

پاکستان نے .... انگریزوں سے لیا ہے جو نہ کلی طور پر برطانوی ہے نہ اسلامی۔"

(ب) جج آخر انسان ہیں انہیں سو فیصد حقیقت پسند نہیں کہا جا سکتا ..... لیکن پاکستان میں اعلیٰ عدالتیں متاثر نہیں ہوتیں۔"

(ج) وہ (یعنی اعلیٰ عدالتیں) قدرتی انصاف نہیں کرتیں بلکہ جو شہادت پیش کی جاتی ہے اس کی بنیاد پر قانونی انصاف کرتی ہیں۔ کچھ بے گناہ لوگ پھانسی چڑھ جاتے ہیں جبکہ جرائم پیشہ لوگ بری ہو جاتے ہیں لیکن عدالت کو اس ریکارڈ کی بنا پر کارروائی کرنی ہوتی ہے جو اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔"

اب میں جناب ایم بی احمد جج (ریٹائرڈ) سے چند استفسار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(۱) کیا آپ نے ۲۵ اپریل ۱۹۷۸ء کے "جنگ" کراچی میں ریٹائرڈ جسٹس محمد افضل چیمہ چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل کا یہ بیان نہیں پڑھا تھا۔؟

(۲) کیا فرائض کی انجام دہی کے دوران یا ریٹائرمنٹ کے بعد نظام عدل میں ایسا ہی کوئی مشاہدہ آپ نے بھی کیا۔؟

(۳) آپ نے بطور جج یا ریٹائرڈ جج اس بھیانک صورتحال سے نمٹنے کے لئے کیا کیا۔؟

(۴) کیا آپ کے علم کے مطابق ہمارے نظام عدل نے ۲۵ اپریل ۱۹۷۸ء کے بعد اس صورتحال کو بدلا۔؟

(۵) جب بے گناہ لوگ بری ہونے سے پہلے کئی کئی ماہ بلکہ سال قید میں گزارتے ہیں یا پھانسی چڑھ جاتے ہیں تو پھر آپ نے کیوں فرمایا کہ "چو حساب پاک است ہے از محاسبہ چہ باک"۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے پاکستان کی عملی زندگی میں کار نیلیس صاحب حمود الرحمٰن صاحب اور یعقوب علی خان صاحب کے بعد آپ بھی ان لوگوں میں آتے ہیں جن کا مقام خاصا بلند ہے۔ یہ تو ہم چھوٹے لوگوں کو ہی زیب دیتا ہو گا جو خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں مقدس حمدیہ اور نعتیہ مقولے جپ کر اسلام کی حمد و ثنا کرتے رہنے کو مسلمانی سمجھتے رہے ہیں یہ تو قرآن اور پیغمبر اسلام والا اسلام نہیں ہے! یہ تو بقول اقبال رح کعبے کے برہمن کی پرستش والا اسلام ہے یہ محض حمدیہ اور نعتیہ عند الضرورت فراڈ کرنے والا مذہب ہے جبکہ قرآن اور اسوۂ حسنہ والا اسلام دستوری قانونی عملی اور اخلاقی تھا مغلوں کے دور میں بھی حالت یہی اور خراب تھی۔ مگر نورجہاں اگر خود آپ عدالت اور انشاء یہ کو خون بہا کی بات نہ بتاتی تو مولانا جہانگیر اور مولانا قاضی مفتی اس کی زندگی کا گھونٹ بھر چکے تھے بڑے خلوص سے اسے پھانسی چڑھا چکے تھے۔ اسلام کا نظام دراصل بنو عباس کے زمانے میں ہی معطل کر دیا گیا تھا اس کے بعد صرف اسلام کے خول کی پرستش ہوتی رہی ہے۔

(عثمان علی کلفٹن کالونی لاہور)

آقائے خمینی روڈ

پاکستان میں کئی اہم سڑکوں اور مقامات کے نام سابق شہنشاہ ایران اور ان کے اہل خانہ کے نام پر رکھے گئے تھے اب جبکہ ایران میں عوام نے آقائے روح اللہ خمینی کی زیر قیادت شہنشاہیت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا ہے پاکستان میں ان سڑکوں اور مقامات کے نام تبدیل کرنا بہت لازمی ہے اس سلسلے میں میری یہ تجویز ہے کہ پاکستان میں جہاں کہیں بھی معزول شاہ ایران اور ان کے اہل خاندان کے نام پر جو شاہراہیں عمارت اور مقامات ہیں ان کے نام تبدیل کر کے آقائے خمینی کے نام پر رکھے جائیں مثلاً راولپنڈی میں "شاہراہ رضا شاہ پہلوی" اور اسلام آباد میں "رضا شاہ پہلوی کیمرا یونیٹ" کے نام تبدیل کر کے "آقائے خمینی روڈ" اور "آقائے خمینی ایونیو" رکھے جائیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ انتظامیہ کو اس بارے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ ایران کی نئی انقلابی حکومت کو سب سے پہلے پاکستان نے ہی تسلیم کیا اور اعلیٰ سطح وفود وہاں مبارکباد اور ہر طرح کی تعاون کی پیشکش کے لئے گئے اگر یہ سب صدق دل سے کیا ہے تو سڑکوں اور عمارات کے نام تبدیل کر کے آقائے خمینی کے نام پر رکھنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے

(محمد رضا حسین آبادی سکردو)

اجرتی گواہ

آج کل قانون کی بالادستی کا بہت چرچا ہے کوئی معاشرہ انصاف اور قانونی ڈھانچہ کے بغیر نہ مہذب کہلا سکتا ہے نہ آسودہ حال ہو سکتا ہے قانون کا اصل مقصد عدالت کے اندر اور باہر عدل و انصاف جاری و ساری رکھنا ہے استحصال ظلم و زیادتی کا خاتمہ کرنا ہے اگر قانون ظلم کا خاتمہ اور انصاف کی بالادستی قائم کر سکے تو اس کا احترام قائم رہتا ہے اگر عدل و انصاف کے قیام سے قاصر رہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا احترام باقی نہیں رکھ سکتی۔

ہمارے قوانین برطانوی قوانین سے مستعار ہیں یہاں ان کا نفاذ تاج برطانیہ کے مفادات کے تحفظ کی خاطر مخصوص انداز میں کیا گیا تھا خفیہ پولیس۔ باغیوں کی نشاندہی کرتی اور خود عینی گواہ بھی فراہم کرتی۔ جو حسب ضرورت وعدہ معاف گواہ بن کر مقدمے کو قطعی ثبوت فراہم کرتے۔ آج بھی ہماری کچہریوں کے گرد ان "اجرتی گواہوں" کی ٹولیاں منڈلاتی نظر آتی ہیں مفادات سرکاری کے تحفظ کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ عدالتی کارروائی پر کسی انداز سے بھی نکتہ چینی اور تنقید نہ ہو سکے۔ حالانکہ خود انگریزی مقولے کے مطابق انصاف ایسا ہونا چاہیئے کہ محسوس کیا جا سکے اور پھر خود ساختہ قوانین میں قطعیت کا عنصر عدل و انصاف کے منافی فیصلوں پر بھی منتج ہو سکتا ہے قانون، جج صاحبان کی رہنمائی تو کر سکتا ہے مگر آخری فیصلہ ان کا ضمیر کر سکتا ہے کذب و صدق میں تمیز کرنا عالم الغیب کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں وہ جس کو چاہے یہ صلاحیت عطا فرما دے عدالتی فیصلے سچ اور جھوٹ کو ممیز کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں خود انگلستان میں برطانوی نظام قانون حرف آخر نہیں سمجھا جا سکتا۔ گزشتہ صدی میں اس میں متعدد ترامیم ہو چکی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں پھر ترقی یافتہ ممالک میں پرائیویٹ سراغرساں ایجنسیاں پولیس کی حریف بنی رہتی ہیں اور اخبارات میں جرائم اور سراغرسانی کے شعبے بھی پولیس کی کارروائی پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور بسا اوقات جرائم کے انسداد میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ہمارے ہاں پرائیویٹ سراغرساں ادارے سرے سے موجود ہی نہیں۔ اخبارات پابند ہیں۔ ادھر عدالت میں سرکاری وکیل انتظامیہ کی بالادستی کا ترجمان پولیس کے اہلکار انتظامیہ کے آلہ کار ہوتے ہیں انہی حالات کے پیش نظر لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کیانی مرحوم نے کہا "کون کہتا ہے کہ یہ عدالت ہے یہ تو کچہری ہے۔"

(فرخ پیرزادہ۔ راولپنڈی)

زبان خلق نقارہ خدا

بحرین میں مقیم پاکستانیوں کے تاثرات

دفتر رابطہ

الفتح

مطبوعات

ماہنامہ

لوح و قلم

چیف ایڈیٹر: بختیار ملک

۶۹- ڈی ۵- نرسری کمرشل ایریا، پی- ای- سی- ایچ- ایس کراچی ۲۹ —— ٹیلیفون نمبر، ۴۳۲۲۲

مدیر اعلیٰ (اعزازی)
ارشاد راؤ

مدیر
واحد بشیر

وقائع نویس
منہاج برنا شبیہہ الحسن

کالم نگار
حسین نقی

انتظامی امور
حاجی عدیل

تزئین
عبد الرحمٰن

اپریل ۱۹۷۹ء

قیمت ۵ روپے

خاص مضامین

جمہوریت ورقانون کی حکمرانی اور حلف کے احترام کی تعلیم لازمی ہے —— منہاج برنا —— ۵

۱۷ نومبر سے پہلے بہت کچھ ہو جائے گا —— غیبوں کی ڈائری —— ۷

وقت کے چیلنج کا مقابلہ جرأت اور پامردی سے کیا جائے —— بھٹو کا خط —— ۱۳

بھٹو کو پھانسی دی گئی تو کیا ہو گا؟ —— شوکت صدیقی —— ۱۵

مقبول ترین رہنما کال کوٹھری تک کیسے پہنچا —— وہاب صدیقی —— ۱۸

بھٹو، آیت اللہ سے دس گنا زیادہ طاقتور ثابت ہوں گے —— پُران چد پڑھ —— ۲۳

نمائندے

اسلام آباد ○ ذوالفقار حیدری
آزاد کشمیر ○ سید نذیر گیلانی

صوبائی نمائندے

سندھ ○ مقیم نواب شاہ ○ محمد نواز خلجی
پنجاب ○ مقیم، لاہور ○ کاشف
سرحد ○ مقیم، پشاور ○ خلیل خاں خٹک
بلوچستان ○ مقیم، کوئٹہ ○ ناصر عرفات

ضلعی نمائندے

حیدرآباد ○ مدد علی بلوچ
تھرپارکر ○ محبوب احمد
سانگھڑ ○ ایاز سندھی
سکھر ○ ارشد حسین
ٹنڈوالہ یار ○ کامل سموں
ملتان ○ ناصر زیدی
گوجرانوالہ ○ محمد افضل جنجوعہ
ٹوبہ ٹیک سنگھ ○ غیاث الدین جانباز
فیصل آباد ○ طارق سعید
گجرات ○ میاں محمد شریف زاہد
میانوالی ○ روشن ملک
سرگودھا ○ الطاف چغتائی
وہشاوڑی ○ احسان ملک
گوادر ○ سلیمان شیروف

بیرونِ ممالک

پیکنگ ○ رشید بٹ
ماسکو ○ محمد زاہد
کینیڈا ○ سعید بن سعود
لندن ○ عبد الحفیظ قریشی
یورپ ○ فاروق طارق
دوبئی ○ غلام جیلانی
کویت ○ ملک نذیر

ناشر: بختیار ملک، مطبع ناظر پریس کراچی

۱۷ نومبر کاش ایسا ہی ہو

۲۳ مارچ کو فوجی پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء نے اسی سال ۱۷ نومبر کو انتخابات کرانے کی تجویز کی منظوری کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ جنرل صاحب کے مقربین خاص تک کے لئے غیر متوقع تھا۔ اس اعلان میں جو یقین دہانی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آئین میں ترامیم کے سلسلے میں جو اگر، مگر اور چونکہ چنانچہ ہے، اس کے بارے میں ہم صرف اس قدر کہیں گے کہ سیاسی اصول و ضوابط اور شرائطِ ملازمت میں بڑا فرق ہے۔ سیاسی اصول و ضوابط آزاد شہری اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے جمہوری طریقے پر طے کرتے ہیں جب کہ شرائطِ ملازمت اجیر اور آجر کے درمیان طے پاتے اور اکثر صورتوں میں ابھی تک آجر یہ شرائط طے کر کے اجیروں پر لاگو کر دیتا ہے۔ اگر پاکستان کے سابقہ اور موجودہ سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو ایک جمہوری ملک کے آزاد شہری اور ملازمینِ سرکار کے آجروں کی حیثیت میں عوام اور صرف عوام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے حکمرانوں اور طرزِ حکمرانی کا فیصلہ کریں۔

یہ تو خیر ضمنی بات تھی اصل مسئلہ یہ ہے کہ انتخابات وعدے کے مطابق ہوں گے بھی! یہ سوال نہ صرف موجودہ حکمرانوں کے مخالفوں کی زبان پر ہے بلکہ ان کے سابق حامی اور موجودہ حاشیہ برداروں کی زبان تک بھی آ گیا ہے۔ ۵ جولائی اور ۱۸ اکتوبر کے درمیان ۱۰۴ دن (حالانکہ اسے ۹۰ دن قرار دیا گیا تھا) کا فاصلہ تھا۔ جب کہ ۲۳ مارچ اور ۱۷ نومبر کے درمیان ۲۵۹ دن حائل ہیں۔ اگر ۹۰ دن کے وعدے کی مدت ۲۷ ماہ طویل ہو سکتی ہے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۵۹ دن کے وعدہ مدت کو کس قدر طول دیا جا سکتا ہے۔ وطن سے محبت، جمہوریت پر یقین اور عوام سے پیار رکھنے والے جانے کب تک ایک ایک لمحہ گن گن کر گزارتے رہیں۔

عام لوگوں کے ان احساسات کے ساتھ سیاسیات کا مطالعہ کرنے والے حلقے اس اعلان کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، سابق صدر، وزیراعظم اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کی سزائے موت کے تناظر میں دیکھتے ہیں اور پچھلے تقریباً پونے دو سال سے استعمال کئے جانے والے اعصابی حربوں میں شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ اب تو اس اعصابی جنگ کو بین الاقوامی سطح تک ترقی دے دی گئی ہے اور موجودہ فوجی حکومت نے بیرونِ ملک پروپیگنڈے کے لئے برطانیہ میں قائم ایک تعلقاتِ عامہ کی کمپنی" اورنبورن مارکیٹنگ کمیونیکیشنز لمیٹڈ" کی خدمات ایک سال کے لئے حاصل کر لی ہیں اور یقین کیا جاتا ہے کہ محنت کش عوام دیارِ غیر میں وطن، اپنے پیاروں سے دوری کے عذاب سہہ کر جو غیر ملکی زرِ مبادلہ بھیجتے ہیں اس کا ایک بڑا حصہ اس کمپنی کو معاوضے کے طور پر ادا کیا جائے گا۔

ہم اربابِ اقتدار سے ایک بار پھر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عوام کی سوچ کو انتشار میں مبتلا کرنے کے لئے جتنے منفی طریقے اختیار کئے جاتے رہیں گے اتنا ہی ان کا اعتبار گھٹتا جائے گا۔ جن ۸۵ فیصد عوام کو وہ سیاسی شعور سے نابلد سمجھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو نہ صرف یہ کہ اپنے حقیقی دوستوں اور نادان دوستوں میں فرق کر سکتے ہیں، بلکہ سامنے موجود اور اس کی ڈور ہلانے والے دشمن کو بھی پہچانتے ہیں۔ انہوں نے اس ملک کو وجود میں لاتے وقت وردی پوش اور غیر وردی پوش سرکاری ملازمین سے رہنمائی حاصل نہیں کی تھی اور اب بھی جب اس ملک کو بچانے اور اس کی تقدیر سنوارنے کا مسئلہ درپیش ہے وہ ان لوگوں کی رہنمائی قبول نہیں کریں گے۔ اگر انہیں اپنا اختیار استعمال کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا تو وہ ایسے مواقع حاصل کرنا جانتے ہیں۔ ایوب خان تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یحییٰ خان اور بھٹو یہ گواہی دینے کے لئے اب تک موجود ہیں۔

پرانی
سیاست گری
خوار ہے

منہاج برنا

جمہوریت قانون کی حکمرانی اور حلف کے احترام کی تعلیم لازمی ہے

جمہوری عمل کو روکنے کے ذمہ دار عوام اور سیاستدان نہیں ہیں

ضمانت دی جائے کہ آئندہ کوئی افسر منتخب اسمبلی اور حکومت کو نہ توڑ سکے!

مارچ کا مہینہ پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے اس بار بھی اس مہینے میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے۔ بین الاقوامی طور پر امریکہ کے صدر کارٹر کا دورۂ مصر و اسرائیل اور ان کی جانب سے دونوں ممالک کے درمیان صلح نامے کی تکمیل کے لئے ان کی تجاویز کے قبول کر لئے جانے کا اعلان دور رس نتائج کا حامل ہے۔ اندرون ملک چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کی ۲۳ مارچ کی تقریر اور ایک مرتبہ پھر عام انتخابات کے لئے قطعی تاریخ کا اعلان اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ایک دن بعد سپریم کورٹ نے سزائے موت کے خلاف سابق وزیر اعظم مسٹر بھٹو کی نظر ثانی کی درخواست کو مسترد کر دیا۔ دونوں واقعات پاکستان کی موجودہ اور آئندہ سیاست کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ دونوں کا باہم ظاہری یا راست تعلق نہیں ہے۔

جہاں تک مسٹر بھٹو کے مقدمہ کا تعلق ہے سپریم کورٹ کی جانب سے نظر ثانی کی درخواست کے مسترد کئے جانے کے بعد یہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ اب ایک ہی مرحلہ باقی ہے اور وہ صدر کی حیثیت سے جنرل ضیاء کے استحقاق ترحم کا استعمال ہے۔ وہ چاہیں تو مسٹر بھٹو کی جان بخشی کر دیں اور چاہئیں تو عدالت کے فیصلہ کے مطابق انہیں پھانسی پر لٹکا دیں۔

جنرل کے لئے اب ایسی وجوہات کی کمی نہیں جن کے پیش نظر وہ حق رحم کو استعمال کرتے ہوئے مسٹر بھٹو کی پھانسی کی سزا میں تخفیف کر دیں اور اسے عمر قید یا چند سالوں کی قید میں بدل دیں دنیا کے تمام ہی قابل ذکر ممالک کے سربراہوں نے بہت پہلے سابق وزیر اعظم کی جان بخشی کے لئے اپلیں کر رکھی ہیں۔ ان کا اب ایک بار پھر اعادہ کیا جا رہا ہے۔ سربراہوں میں امریکہ، روس، چین برطانیہ، فرانس جیسے ممالک کے علاوہ سعودی اور دوسرے اسلامی ممالک کے سربراہان مملکت شامل ہیں۔ اندرون ملک بھی بڑے پیمانے پر جان بخشی کی اپلیں صدر کو بھیجی گئی ہیں۔ ان میں پیپلز پارٹی کے علاوہ بائیں بازو کی جماعتوں کے ایسے رہنما بھی شامل ہیں جو بھٹو صاحب سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں جنرل ضیاء کو سپریم کورٹ کے فیصلہ کے ان الفاظ کو اہمیت دینا ہو گی جن میں عدالت نے یہ کہا کہ انتظامیہ رحم کے حق کو استعمال کرتے ہوئے ان دلائل پر غور کر سکتی ہے جو صفائی کے وکیل نے پیش کئے ہیں۔ ان الفاظ کی تعبیر میں بڑی گنجائش ہے۔ ایک طرف عدالت نظر ثانی کی درخواست کو مسترد کرتی ہے اور سزائے موت بحال رکھتی ہے اور دوسری طرف حکام سے کہتی ہے کہ وہ رحم کے حق کے استعمال کے وقت وکیل صفائی کے دلائل پر غور کریں۔ ظاہر ہے کہ بالواسطہ طور پر اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی دشواری بظاہر نظر نہیں آتی کہ عدالت جاں بخشی کے حق میں ہے۔ اگرچہ عدالت نے اپنے اس فیصلہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جس کے تحت، مسٹر بھٹو کو مجرم قرار دیا گیا ہے۔ بہر حال جنرل ضیاء کو اب یہ فیصلہ کرنا ہو گا وہ بھٹو صاحب کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے ان کی جان بخش دیں، یا عدالت کے فیصلہ پر تکنیکی طور پر عمل درآمد کرتے ہوئے انہیں پھانسی پر لٹکا دیں۔ اگر انہوں نے فیصلہ کے تکنیکی پہلو کو زیادہ اہمیت دی اور عدالت کی بالواسطہ اپیل کو نظر انداز کر دیا تو اس سے ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو مسٹر بھٹو کو سیاسی طور پر شکست دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس ضمن میں سیاسی رہنماؤں اور بعض اخبارات کا رد عمل قابل غور ہے جہاں تک حکومت میں شامل قومی اتحاد کی سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کا عمل قابل فہم ہے۔ ان سب کی خواہش ہے کہ مسٹر بھٹو پہلی فرصت میں پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں۔ چودھری ظہور الٰہی نے کہا ہے کہ مسٹر بھٹو اللہ کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں اور اس سے نہیں نکل سکتے۔ مفتی محمود، میاں طفیل محمد، جان محمد عباسی ان سب کا رد عمل ایک جیسا ہے لیکن زیادہ دلچسپ رویہ ان جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کا ہے جو پہلے قومی اتحاد میں شامل تھیں لیکن اب اس سے باہر ہیں یعنی تحریک استقلال، جمعیت علمائے پاکستان اور این ڈی پی۔ تحریک استقلال کے رہنما سابق ائیر مارشل اصغر خان نے فرمایا کہ بھٹو کی زندگی یا موت ضیاء الحق کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس حقیقت کا علم تو سبھی کو ہے۔ اخبار نویسوں نے ان سے بار بار سوالات کئے اور ان سے یہ کہلانے کی کوشش کی کہ وہ کسی طرح

بھٹو صاحب کے لئے رحم کی اپیل کر دیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ایک اخبار نویس نے ان سے پوچھا کہ فرض کیجئے کہ آپ ضیاء الحق صاحب کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے تو فرمایا کہ یہ ایک مفروضہ کی بات ہے۔ اسی طرح مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے فرمایا کہ پاکستان کی سالمیت کسی کی ذات سے وابستہ نہیں، جو بظاہر ایک صحیح بات ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک فرد سے ملک کے مستقبل کو وابستہ نہیں کیا جا سکتا اور کسی ایک فرد میں مولانا نورانی بھی شامل ہیں۔ لیکن وہ بھی اصل جواب سے کترا گئے۔ این ڈی پی کے صدر سردار شیر باز مزاری صاحب نے کہا کہ سپریم کورٹ سے بھٹو صاحب کے لئے سزائے موت کی بحالی پر انہیں افسوس ہے لیکن یہ عبرت کی بات ہے جماعت اسلامی کے اخبار نے ان کے یہ فقرے نقل کرتے ہوئے قارئین کو مطلع کیا کہ یاد رہے کہ بھٹو حکومت کے دور میں جناب مزاری اور ان کے خاندان کو قید و بند کی صعوبتوں اور مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔" اس نوعیت کے تبصروں سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام حضرات سابق وزیر اعظم کے لئے ان کی موت کے بعد دعائے مغفرت کرنے کے حامی ہیں۔ اس سے پہلے نہیں۔

الیکشن کرانے کا مشروط وعدہ

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحب نے ۲۳ مارچ کو ایک بار پھر ملک میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا ہے۔ انہوں نے ۱۷ نومبر کی تاریخ کا اعلان کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے اتنی بہت سی شرطیں لگا دی ہیں کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ آیا صدر صاحب نے بہ رضا و رغبت الیکشن کرانے کا اعلان فرمایا ہے یا طوعاً و کرہاً۔ انہوں نے اس اعلان کی جس طرح تمہید باندھی ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اعلان کچھ زیادہ خوشی کے ساتھ نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ بے شمار لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ انتخابات نہ کراؤ۔ یا بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ مغربی طرز کے الیکشن مذہبی اعتبار سے جائز نہیں۔ پھر بھی وہ الیکشن کروائیں گے اور انہوں نے ۱۹۷۹ء کو انتخابات کا سال قرار دے دیا ہے۔ انہوں نے ایک بار نوے روز میں بھی انتخابات کرانے کا حتمی وعدہ کیا تھا۔ وہ آخر طاقِ نسیاں کے حوالے ہوا۔ اب اس نئے وعدے کو بھی دیکھنا چاہئے کہ واقعی یہ ایفا ہوتا ہے یا نہیں، یا یہ بھی ہرجائی معشوق کے وعدۂ فردا میں بدل جائے گا۔ آثار تو اچھے نہیں خاص طور سے جنرل صاحب کی "اگر مگر" کی وجہ سے۔ اس ضمن میں ان کے یہ ارشادات قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ انتخابات ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق ہوں گے اور آئین کی بنیادی باتوں کو انتخابی مہم میں بحث و مباحثہ کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ ان امور میں اسلامی نظریہ پاکستان، صوبائی خود مختاری اور وفاقی پارلیمانی نظام شامل ہیں انتخابات کے لئے اوامر و نواہی کا اعلان کیا جائے گا اور اس سلسلے میں یحییٰ خان حکومت کی طرح ایک فریم ورک آرڈر جاری کیا جائے گا اور سوئم یہ کہ انتخابات سے پہلے ۱۹۷۳ء کے آئین کی ان دفعات میں ترمیم کریں گے جن کا تعلق صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات سے ہے تاکہ بقول ان کے دونوں کے اختیارات میں توازن پیدا کیا جا سکے۔ انہوں نے یہ وضاحت خود ہی کر دی ہے کہ وزیر اعظم ملک کا چیف ایگزیکٹیو ہوگا اور صدر اسلامی جمہوریہ کی علامت اور آئین کا محافظ ہوگا۔ اب آپ نے غور کیا کہ اگر جناب صدر کی یہ تمام باتیں نہ مانی گئیں تو پھر انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ الیکشن کرائیں۔ اگر وہ آئینی حکومت کو برطرف کر کے مارشل لاء نافذ کر سکتے ہیں، آئین کو معطل کر سکتے ہیں اور من مانے طور پر اور اپنی ذاتی منشاء کے مطابق اس میں ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتے ہیں تو پھر اگر وہ یہ فیصلہ کریں گے کہ ۱۷ نومبر کو بھی الیکشن نہیں ہوں گے اور وہ بدستور مارشل لاء کے تحت ملک کا نظم و نسق چلاتے رہیں گے تو انہیں کون روکنے والا ہے۔ آپ کہیں گے عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں، بالکل بجا فرمایا لیکن اس وقت جب وہ اپنی بات منوانے کی طاقت رکھتے ہوں جس طرح ایران کے عوام نے اپنی بات منوائی اور بادشاہت ختم ہوئی۔ پھر جنرل صاحب نے چند باتیں فرض کر لی ہیں جن کے حلقۂ دامِ خیال میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور انہیں منوانے پر مصر ہیں۔ مثلاً ان کا ایک خیال یہ ہے کہ جمہوری عمل سیاستدانوں کی وجہ سے رک جاتا ہے اور فوج کو بار بار مارشل لاء لگانا پڑتا ہے اور مجبوراً ملک پر حکومت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے آئین میں مسلح افواج کے لئے (یعنی افواج کے بڑے افسروں کے لئے) ایک کردار متعین کر دیا جائے۔ انہیں ملک کی منتخب پارلیمنٹ اور اس میں شامل منتخب نمائندوں سے بالاتر ایک حیثیت دے دی جائے کہ جب چاہیں وہ فیصلہ کریں کہ کس وقت ملک کی منتخب پارلیمنٹ کو توڑ دیا جائے یا معطل کر دیا جائے اور فوج مارشل لاء نافذ کر کے حکومت کرے۔ ان کا ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ انتخابی مہم کو زیادہ طویل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس سے گڑبڑ ہوتی ہے جس طرح بقول ان کے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں ہوئی تھی اور تیسرا مفروضہ یہ کہ جمہوریت ایسی ہونی چاہئے جو پاکستان کے عوام کے مزاج سے مطابق ہو۔ مغربی طرز کی جمہوریت صحیح نہیں ہے۔

جنرل صاحب کے تمام مفروضے ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں ورنہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ پاکستان میں جب جب جمہوری عمل رکا ہے اس کی ذمہ دار مسلح افواج بالخصوص بری فوج کی قیادت رہی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان نے ۵۶ء کا آئین منسوخ کر کے پارلیمنٹ کو توڑا اور مارشل لاء نافذ کر کے جمہوری عمل کو روکا حالانکہ یہ وہ موڑ تھا جب ملک میں پہلے عام انتخابات ہونے والے تھے یہ حقیقت کہ یہ مارشل لاء امریکی سامراج کی ایماء اور حمایت سے لگایا گیا تھا اب کسی سے مخفی نہیں ہے۔ ایوب خان جب عوامی تحریک کے دباؤ کے تحت اقتدار سے دستبردار ہوئے تو انہوں نے اپنے ہی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقتدار قومی اسمبلی کے اسپیکر کے حوالے کرنے کے بجائے فوج کے کمانڈر ان چیف کو سونپ دیا۔ یہ صریحاً آئین اور قانون کی خلاف ورزی تھی۔ یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالتے ہی از سر نو ملک میں مارشل لاء لگا دیا اور اس طرح جمہوری عمل کو روکا۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے عام انتخابات منعقد کرا کے جمہوری عمل کو بحال کرنے کی جو سعادت حاصل کی تھی اس پر انہوں نے اس طرح پانی پھیر دیا کہ جمہوری عمل کے دوسرے تقاضے کو پورا کرنے سے انکار کر دیا اور اقتدار ملک کے منتخب نمائندوں کو منتقل نہیں کیا اور چھ نکات کے نام پر مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کر دیا۔ اس پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسمبلی کے اجلاس کے التوا کا مطالبہ بعض سیاستدانوں بالخصوص مسٹر بھٹو نے بھی کیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اقتدار کس کے پاس تھا بھٹو کے پاس یا جنرل یحییٰ اور ان کی ملٹری کونسل کے پاس۔ لہٰذا بنیادی طور پر مشرقی پاکستان کے بحران اور بعد میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لئے اس ملک کے عوام یا سیاستدان نہیں بلکہ مسلح افواج اور یحییٰ حکومت کی صورت میں مارشل لاء حکومت اور اس کی ۲۵ مارچ والی فوجی کارروائیاں ذمہ دار ہیں اسی طرح ہندوستانی فوج کے سامنے ہماری فوج کے ہتھیار ڈالنے کی ذمہ داری بھی اس ملک کے عوام یا سیاستدانوں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس کے بعد ۵ جولائی ۷۷ء کو جس طرح جمہوری عمل کو روکا گیا اس کے لئے سیاستدانوں یا اس ملک کے عوام کو ذمہ دار قرار دینا ڈھٹائی ہی قرار دیا جا سکتا ہے عوام نے تو اخباروں میں پڑھا تھا کہ پی این اے اور پیپلز پارٹی کے مذاکرات کامیاب ہوئے ہیں اور ان کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا ہے موجودہ مارشل لاء کے نفاذ کے لئے بھی اس ملک کی مسلح افواج خصوصیت سے بری فوج اور اس کے کمانڈر انچیف اور دوسرے فوجی کمانڈر ذمہ دار ہیں اور انہیں یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہئے چنانچہ آپ نے دیکھا کہ جمہوری عمل کو کون روکتا ہے اور کیوں روکتا ہے۔ اس لئے صدر صاحب کا یہ خیال کہ انتخابات بجائے خود کوئی بری چیز ہیں یا لمبی انتخابی مہم کی وجہ سے کوئی خرابی ہوتی ہے صحیح

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

۱۷ نومبر سے پہلے بہت کچھ ہو جائے گا

غینوں کی ڈائری

سپریم کورٹ نے نواب محمد احمد خان کے قتل کے مقدمے میں لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سابق وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی نظر ثانی کی درخواست بھی خارج کر دی ہے، البتہ عدالت نے صدر جنرل محمد ضیاالحق کو کہا ہے کہ دفاع کے وکیل مسٹر یحییٰ بختیار نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان پر وہ "رحم" کرنے کا استحقاق

۲۴ مارچ سے ایک دن پہلے کی کاروائیاں بہت اہم ہیں

استعمال کرتے وقت غور کریں۔ اس طرح عدالت نے مسٹر بھٹو کی جان بچانے کے سلسلے میں اب بھی ایک دروازہ کھلا رکھا ہے اور ساری ذمہ داری جنرل ضیاالحق پر چھوڑ دی ہے۔ اب ساری قوم کی نظریں جنرل ضیاالحق پر لگی ہوئی ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے نے جنرل صاحب کی یہ "حجت" ختم کر دی ہے کہ وہ وہی کریں گے جو سپریم کورٹ فیصلہ دے گی۔ اس طرح جنرل بھٹو کو پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کرنے

یہ چارپائی میرے بعد آنے والے کو دیدیجئے

خصوصی رپورٹ

بھٹو حالات کا جرأت اور بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں

بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو (جو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند ہیں) نے ۲۰ مارچ کو راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں جناب ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی، جو آدھ گھنٹے تک جاری رہی۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ملاقات کے دوران مسٹر بھٹو نے بلند آواز میں کہا "میں بے گناہ ہوں اس لئے میں کسی کو بھی رحم کی درخواست کرنے کی اجازت نہیں دوں گا اور نہ کوئی ایسا کرے گا۔ خواہ وہ میری بیویاں ہوں بچے ہوں یا ایسے لوگ جن سے خون کا رشتہ ہے"

پیپلز پارٹی کے ایک ترجمان کے مطابق سپریم کورٹ سے نظر ثانی کی درخواست مسترد ہو جانے کے بعد جیل حکام نے مسٹر بھٹو سے بیڈ، میز، کرسی، کتابیں، لکھنے کے کاغذ پین، سیاہی، نجی کپڑے، شیو کا سامان وغیرہ واپس لے لیے ہیں اب مسٹر بھٹو زمین پر سوتے ہیں اور قیدیوں کا لباس پہنتے ہیں جیل حکام نے گھر کا کھانا بھی بند کر دیا چنانچہ تین دن تک مسٹر بھٹو نے احتجاجاً کھانا نہیں کھایا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ کھانے میں حکام کچھ ملا دیں اور بعد میں کہیں کہ بھٹو نے مایوس ہو کر خودکشی کر لی۔

اس اطلاع کہ سپریم کورٹ نے سزائے موت بحال رکھی ہے اور توہین آمیز رویے کے باوجود مسٹر بھٹو ذرہ بھر پریشان دکھائی نہیں دیتے اور انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کے اعصاب زیادہ مضبوط ہیں۔ مسٹر بھٹو اپنی عادت کے مطابق چلتے پھرتے ہیں، بتایا جاتا ہے کہ جب جیل حکام بیڈ، میز، کرسی اور دیگر سامان واپس لینے کے لئے مسٹر بھٹو کی کال کوٹھری میں گئے تو جناب بھٹو نے اپنا بستر خود ہی بیڈ سے اٹھا کر زمین پر بچھا لیا اور اس پر بیٹھ گئے، جیل حکام اپنے ساتھ لوہے کی ایک زنگ آلود چارپائی لے کر گئے تھے وہ انہوں نے کوٹھری میں بچھا دی اور کہا "آپ اس پر بستر بچھا لیں"، بھٹو صاحب نے جواب دیا "نہیں اس چارپائی کو لے جائیے اور میرے بعد آنے والے کے لئے محفوظ رکھیے یا اُسے ابھی ہی پہنچا دیجئے۔"

راولپنڈی میں مسٹر بھٹو کی کوٹھری کے کچھ دور ہی ایک "سیل" بنایا جا رہا ہے جس پر تقریباً سات لاکھ روپے کی لاگت آئے گی۔ جناب بھٹو نے ایک دن جیل حکام سے پوچھا "یہ کیا بن رہا ہے۔؟"

جواب ملا "خصوصی سیل"۔ جناب بھٹو نے بے ساختہ کہا "سیل یا میں"۔ ●●

مارچ کی کوکھ سے...

ماہ مارچ، پاکستان کی تاریخ میں نمایاں اہمیت رکھتا ہے اس ماہ ایسے فیصلے اور اقدامات کئے گئے، ایسے واقعات رونما ہوئے، جن کے دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ جن سے نہ صرف پاکستان کے عوام متاثر ہوئے بلکہ پورا جنوبی ایشیا متاثر ہوا۔ سیاست نے نئے رخ اختیار کئے۔ ذیل میں انہی واقعات کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔

● ۲۴ مارچ، سندھ کی تاریخ کا ایک یادگار دن ہے اس دن سندھڑی کا عظیم فرزند اور حریت پسند "مر ڈلیسوں پر سندھ نہ ڈلیسوں" (مر جائیں گے مگر سندھ نہیں دیں گے) کا نعرہ لگاتے ہوئے سندھ پر قربان ہو گیا۔ اور ۲۴ مارچ کو ہی سپریم کورٹ آف پاکستان نے ملک کے پہلے منتخب وزیر اعظم مسٹر بھٹو کی نظر ثانی کی درخواست مسترد کر دی اور بھٹو، جس نے کوشش کی تھی کہ ان چہروں پر مسکراہٹ آ جائے اور ان روحوں کو قرار مل جائے جو موہنجو دڑو کی تعمیر کے وقت سے کڑوے کسیلے آنسو بہاتی رہی ہیں کی سزائے موت کا فیصلہ بحال رکھا۔

تاریخ ایک ہی ہے البتہ کرداروں کے نام مختلف ہیں اور سال بھی مختلف۔ پہلا واقعہ ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو رونما ہوا، برطانوی نوآبادکار سندھڑی کے عوام کو آزادی سے محروم کرنے، انہیں محکوم بنانے اور سندھ کی دولت لوٹنے کا منصوبہ بنا چکے تھے، جنگ میانی میں میران حیدر آباد شکست کھا چکے تھے، اب انگریزوں کو میر شیر محمد خان حکمران میرپور کے مقابلہ تھا انگریزوں کی فوج حیدر آباد سے چار کوس دور ٹنڈو موسیٰ خان کھتران کے متصل پھلیلی کے کنارے پر مشرق کی جانب آئی جس کی کمان سر چارلس نیپئر کر رہا تھا اور یہیں پر ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو میدان کارزار گرم ہوا یہ جنگ تاریخ میں "جنگ دبہ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے اس جنگ میں جس دلیر اور بہادر نے انگریزوں سے اپنی شجاعت کا لوہا منوایا اس کا نام ہوش محمد تھا۔ یہ میر صوبیدار خان حکمران حیدر آباد کا غلام تھا اور اپنی شجاعت بہادری کی وجہ سے فوج میں اہم عہدہ حاصل کیا تھا جب اس کے پرانے آقا (حکمران حیدر آباد) نے اس کی مخالفت کے باوجود انگریزوں کی محکومی اختیار کر لی تو آزادی کا یہ متوالا شیر سندھ میر شیر محمد خان آف میرپور کے پاس چلا گیا۔ اور اس کی طرف سے انگریزوں سے لڑا۔ ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو ہوش محمد خان اپنے فوجی دستے کے ساتھ نہایت آن بان سے میدان جنگ میں آیا اور "مر ڈلیسوں پر سندھ نہ ڈلیسوں" کا نعرہ لگاتے ہوئے دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑا۔ اور مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مادر وطن پر قربان ہو گیا۔ چارلس نیپئر، ہوش محمد خان کی شجاعت اور بہادری سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ہوش محمد شہید کی تجہیز و تکفین پورے فوجی احترام کے ساتھ کی اسے حیدر آباد کے قلعے میں دفن کیا اور قبر پر ایک توپ نصب کرائی، سر چارلس نیپئر نے ہوش محمد شہید کی شجاعت و بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا "وہ مر چکا تھا مگر پھر بھی تلوار پر اس کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس جنگ میں محمد خان تھورہ نے غداری کی اور سندھی فوج کے بارود خانے میں آگ لگا دی نتیجہ انگریزوں کی فتح میں نکلا۔ اور سندھ غلام بنا لیا گیا۔

تاریخ کے ریکارڈ کے لئے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ میران حیدر آباد میر محمد نصیر خان اور میر شہداد خان انگریزوں سے جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ انگریزوں کی "معاہدۂ غلامی" پر دستخط کرنے کو تیار تھے۔ بختیار خان لغاری نے "آزادی یا موت" کے حق میں دلائل دیئے تو نصیر خان نے کہا "لڑائی کا نام بھی برا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ میدان جنگ میں کس فریق کو فتح ہو اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ ہم انگریزوں کے مقابلے میں کامیاب بھی ہو جائیں گے تو پھر بھی ہم سندھ کے خرمن امن و امان میں ایک ایسی چنگاری لگا دیں گے جو ہمیشہ کے لئے اہل سندھ کو خائف اور بے آرام بنا دے گی مخالفت اور دشمنی ایک تنکے کی بھی اچھی نہیں، چہ جائیکہ انگریزوں کی دشمنی"، مگر حریت پسندوں کی جانب سے دباؤ پڑنے پر میران حیدر آباد جنگ میں شامل ہوئے لیکن نیم دلی کے ساتھ اور جنگ میانی کی شکست کے فوراً بعد انہوں نے انگریز فوج کے کمانڈر سر چارلس نیپئر کو خط لکھا جس میں لکھا کہ "ہمیں بلوچوں کی حماقت پر افسوس ہے کہ انہوں نے آپ سے جنگ کی ٹھانی" میروں نے جنگ میں اپنی شرکت پر اظہار شرمندگی کیا، معذرت مانگی۔ اور ملاقات کی تمنا ظاہر کی۔ چارلس نیپئر نے انہیں بلایا اور گرفتار کر لیا اور انگریزی فوج بغیر مقابلے کے حیدر آباد قلعے میں داخل ہو گئی تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ میران حیدر آباد کی اولاد میر علی احمد تالپور اور میر رسول بخش تالپور آج بھی سرکار کی خوشنودی

کا حکم صادر کرنے کے پابند نہیں رہے۔ بلکہ اب تو ان پر اخلاقی ذمہ داری عائد کر دی گئی ہے کہ وہ "رحم" کا استحقاق استعمال کرتے وقت کیپٹل بخشیار کے دلائل کو مد نظر رکھیں۔

سپریم کورٹ کے تازہ فیصلے کے بعد "قوم کی کیفیت" میں ظاہری طور پر کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں آئی۔ ایسے لگتا ہے کہ "قوم" یہ سب کچھ پوری توجہ اور خاموشی سے دیکھ رہی ہے، مگر ان سب واقعات کے بارے میں عوام کیا نتیجہ اخذ کر رہے ہیں، اس کے بارے میں مختلف لوگوں کو مختلف آرا ہیں۔ جماعتی اور پی این اے کے حلقے بغلیں بجا رہے ہیں کہ قوم چاہتی ہے کہ "خس کم جہاں پاک" مگر غیر جانبدار مبصر اس خاموشی کو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ قرار دے رہے ہیں۔ اس بات کے سب سے بڑے گواہ قانون پر عمل درآمد کرنے والے اداروں کے وہ وردی پوش نوجوان ہیں جن کو سارے سندھ میں اہم تنصیبات اور ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں تعینات کر دیا گیا ہے۔ ان نوجوانوں کے ہاتھوں میں اسلحہ ہوتا ہے مگر ان کی آنکھیں لوگوں کے چہروں پر ہوتی ہیں اور وہ ان چہروں اور ان آنکھوں میں رقصاں جذبات اور کہانیوں کو بخوبی پڑھ سکتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ یہ اہتمام اب بھی برقرار ہے ایسا لگتا ہے کہ حکومتی مشینری کو سندھ کے لوگوں پر اعتماد نہیں رہا (پتہ نہیں پنجاب اور ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ اہتمام ہے یا نہیں) ایک طرف یہ "اہتمام" ہے۔ دوسری طرف سرکاری اخبارات یہ خبریں شائع کر رہے ہیں کہ بھٹو کے فیصلے کے بعد ہر جگہ "خاموشی" ہے۔ اگر یہ "خاموشی" ان خصوصی انتظامات سے مربوط نہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتظامات کب تک رہیں گے؟

حال ہی میں مسلم لیگ چٹھہ گروپ کے رہنما سندھ کا دورہ کر کے کراچی پہنچے تو انہوں نے ایک مسلم لیگی رہنما

میں لگی ہوئی ہے اور ایک غیر منتخب حکومت میں شامل ہے جبکہ شیر سندھ میر شیر محمد کی اولاد میر علی بخش تالپور آج بھی اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جمہوریت کے قیام کے لئے اور جبر و تشدد کے خاتمہ کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

● مارچ ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے آئین پر نظرثانی کی اور اس میں ترامیم کیں۔ مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ ایسی سیلف گورنمنٹ کے قیام کا مطالبہ کیا جو ہندوستان کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ آئین میں ترمیمات کی وجہ سے سر آغا خان اور امیر علی نے مسلم لیگ سے استعفےٰ دے دیا اور قائد اعظم محمد علی جناح مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔

● مارچ ۱۹۱۹ء میں رسوائے زمانہ رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا اس کے خلاف قائد اعظم نے قانون ساز اسمبلی میں معرکۃ الآرا تقریر کی، عوام اور سیاسی جماعتوں نے اس ایکٹ کے خلاف زبردست احتجاج کیا جسے برطانوی حکومت نے نہایت بے رحمی سے کچل دیا "جلیانوالہ باغ" کے جس جلسے پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی وہ بھی رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں منعقد کیا گیا تھا۔

● مارچ ۱۹۳۱ء میں عظیم بطل حریت بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو لاہور میں پھانسی دی گئی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ لاہور کا کوئی بھی انگریز، مسلمان، اور ہندو مجسٹریٹ، آزادی کے ان متوالوں کی سزائے موت پر عمل درآمد کروانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ سب نے انکار کر دیا لیکن قصور کا اعزازی مجسٹریٹ نواب محمد احمد خان تیار ہو گیا۔ اسے قصور سے لاہور بلوایا گیا۔ اس نے اپنے سامنے ان سامراج دشمنوں کو پھانسی پر لٹکوایا۔ جب بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے گلوں میں پھندا ڈالا گیا تو انہوں نے پھندے کو چوم کر "انقلاب زندہ باد، سامراج مردہ باد" کے گرجدار نعرے لگائے جس جیل میں انہیں پھانسی دی گئی، وہاں اب شادمان کالونی ہے اور ۴۳ سال کے بعد اسی جگہ نواب محمد احمد خان قتل ہوا۔

● مارچ ۱۹۳۳ء میں گول میز کانفرنس نے اپنی سفارشات پیش کیں۔

● ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ نے "قرارداد لاہور" منظور کی جس میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ آزاد وطن کا مطالبہ کیا گیا بعد میں اس قرارداد کو "قرارداد پاکستان" کہا جانے لگا۔

● ۱۱ مارچ ۱۹۴۲ء کو چرچل نے کرپس وفد ہندوستان بھیجنے کا اعلان کیا تاکہ ہندوستان کی آزادی کا فارمولا مرتب کیا جا سکے۔

● مارچ ۱۹۴۷ء میں آخری وائسرائے کی حیثیت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان لائے۔ انہیں تاج برطانیہ نے ہندوستان کی تقسیم کی ذمہ داری سونپی تھی۔

● مارچ ۱۹۴۸ء میں بلوچستان میں فوجی کارروائی کا آغاز ہوا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فوج کو عوام کے خلاف استعمال کیا گیا۔

● مارچ ۱۹۵۳ء میں پاکستان کی تاریخ کا پہلا مارشل لاء لاہور میں نافذ کیا گیا اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل اعظم خان نے ختم نبوت کے حامی مظاہرین کو گولی مارنے کا حکم دے دیا۔ سینکڑوں لوگ ہلاک ہوئے۔

● ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو بیوروکریسی کا تیار کردہ آئین جو ۱۹۵۶ء کے آئین کے نام سے مشہور ہے، نافذ کیا گیا۔ پاکستان کو "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کا نام دیا گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس آئین کو آئین ساز اسمبلی نے اتفاق رائے سے منظور نہیں کیا تھا، حزب اختلاف کے لیڈر حسین شہید سہروردی منظوری کے وقت اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئے تھے اور یہ آئین غالباً دنیا کا واحد دستور تھا جس میں الیکشن کا طریقہ کار نہیں بتایا گیا تھا اور الیکشن کا طریقہ کار طے کرنے کی ذمہ داری آئندہ منتخب ہونے والی اسمبلی پر چھوڑ دی گئی تھی

● مارچ ۱۹۶۳ء کی پہلی تاریخ کو کراچی کے صنعتی علاقے کی سڑکیں زندہ رہنے کا حق مانگنے والے مزدوروں سے لالہ زار ہوئیں اور محنت کش طبقوں اور ایوب حکومت کے درمیان کھلی دشمنی کی ابتداء ہوئی۔

● مارچ ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان نے ایوب خان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ اسمبلیاں اور آئین توڑ دیئے گئے۔

● مارچ ۱۹۷۱ء میں جنرل یحییٰ خان نے عوامی لیگ پر پابندی لگا دی اور مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا حکم دے دیا جس کا نتیجہ بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں برآمد ہوا۔ پاکستان مشرقی بازو سے محروم ہو گیا۔

● مارچ ۱۹۷۷ء میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پاکستان کی تاریخ کے دوسرے عام انتخابات ہوئے۔ قومی اتحاد نے الیکشن کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا اور منتخب حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک چلائی جس کا نتیجہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو بھٹو حکومت کی معزولی اور مارشل لاء کے نفاذ کی صورت میں برآمد ہوا۔

● ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو لاہور ہائیکورٹ کی فل بنچ نے معزول وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے الزام میں سزائے موت سنائی۔

● ۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے بھٹو کی سزائے موت کے فیصلے کے خلاف نظرثانی کی درخواست کو مسترد کر دیا اور اپنا اکثریتی (۴-۳) فیصلہ (جو ۶ فروری ۱۹۷۹ء کو سنایا گیا تھا) بحال رکھا۔

***

ہارون احمد کے مکان پر ایک عدد پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ پریس کانفرنس کے بعد کھانے پر ایک رہنما نے ملک قاسم سے پوچھا کہ سندھ کے کیا حالات ہیں تو انہوں نے بے دھڑک کہا۔ "جی بالکل ٹھیک ہیں" اخباری نمائندے نے پوچھا کہ "کیا انہیں سندھ میں جگہ جگہ فرنٹیئر کانسٹیبلری اور فوج کے لوگ متعین نظر نہیں آتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ انہیں فرنٹیئر کانسٹیبلری کے لوگ تو نہیں البتہ فوج کے جوان نظر آتے۔ اس طرح ملک قاسم نے کم سے کم یہ بات تو تسلیم کر لی کہ سندھ میں جگہ جگہ فوج کے لوگ متعین ہیں۔

اس ہفتے ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ ۲۳ مارچ کو راولپنڈی میں فوجی پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے صدر جنرل ضیاء الحق نے ۱۷ نومبر کو عام انتخابات کرانے کا غیر متوقع اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا۔ یہ بات قابل توجہ تھی کہ جنرل نے یہ اعلان ۲۴ مارچ سے ایک دن پہلے کیا جب سپریم کورٹ کی طرف سے بھٹو کی نظر ثانی کی درخواست کے فیصلے کا اعلان ہونا تھا معلوم ہوا ہے کہ سابق وزیر داخلہ اور مسلم لیگ قیوم گروپ کے سربراہ خان عبدالقیوم خان جو پہلے ہی کراچی پہنچ چکے تھے ۲۳ مارچ کو انٹرکان کے ایک کمرے میں جہاں ان کی رہائش تھی اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ گپیں کر رہے تھے تو ان کے ایک اور ساتھی نے آ کر ان کو یہ بتایا کہ جنرل صاحب نے ۱۷ نومبر کو عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا ہے تو قیوم خان حیران ہو گئے اور غیر دانستہ طور پر ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "اچھا یہ بات ہے تو پھر بھٹو نہیں بچتے۔" ویسے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ سپریم کورٹ کے فیصلے سے پہلے پی این اے کے جس رہنما سے بھی ملاقات ہوتی تھی وہ بڑے اعتماد اور یقین سے کہتے ہوتے پایا جاتا کہ "بھٹو کو پھانسی ہو جائے گی"

(باقی ص ۴۹ پر)

اِدھر تردید کی جا رہی تھی، اُدھر افغان بھگوڑے پریس کانفرنس کر رہے تھے

سرکاری تقریب صرف سرکاری اخباری نمائندوں کے لئے

سرحد — خلیل خان خٹک

جنرل ضیاء الحق پچھلے ہفتے مختصر دورے پر پشاور تشریف لائے۔ ان کی آمد کا مقصد جنگ کے دوران شہید ہونے والے فوجیوں کے ورثا اور معذور فوجیوں میں نو تعمیر کوارٹروں کے الاٹمنٹ کے کاغذات تقسیم کرنا بتایا گیا تھا لیکن باخبر حلقوں کے مطابق انہوں نے پشاور میں قیام کے دوران سنیئر افسروں سے بعض انتہائی اہم امور کے بارے میں بات چیت بھی کی۔ ان امور کا تعلق پاک، افغان تعلقات، سرحدی صورتحال اور صوبہ سرحد میں افغانستان کے نام نہاد مجاہدین اسلام کی آمد سے بتایا جاتا ہے۔ انہوں نے ایئر ہیڈ کوارٹرز کا دورہ بھی کیا اور وہاں فضائیہ کے چیف آف اسٹاف ائیر مارشل محمد انور شمیم سے تبادلہ خیال کیا۔

پروگرام کے مطابق جنرل ضیاء کو سابق فوجیوں کی تقریب میں شرکت کے فوراً بعد راولپنڈی واپس چلا جانا تھا اور اخبار نویسوں سے ملاقات ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھی۔ سابق فوجیوں کی تقریب میں دو اخبار نویسوں کے سوا کسی صحافی کو جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور پشاور کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ مقامی اخبار نویسوں کو سربراہ مملکت کی کسی ایسی تقریب میں مدعو نہیں کیا گیا جو نجی نوعیت کی نہیں بلکہ خالص سرکاری تقریب تھی۔ جنرل ضیاء کے افسر تعلقات عامہ کرنل صدیق سالک کی بریفنگ کے لئے بھی فقط ان ہی دو اخبار نویسوں کو بلوایا گیا اور اس دوران موصوف نے بتایا کہ صدر اخباری نمائندوں سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ خیال ہے کہ انہوں نے افغانستان سے متعلق معاملات پر اظہار خیال کے لئے اخبار نویسوں سے ملنے کا فیصلہ بعض سنیئر افسروں کے ساتھ بات چیت کے بعد کیا۔ باوثوق ذرائع کے مطابق اس بات چیت میں افغانستان کے متعلق بعض سیاسی لیڈروں کے بے سروپا بیانات ایک سیاسی جماعت کی "اودرایکٹنگ" اور صوبہ سرحد کے بعض حصوں میں افغان بھگوڑوں کی سرگرمیوں کی طرف صدر کی توجہ دلائی گئی جس سے خاص طور پر اس حساس صوبے میں تکدر کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ سوویت یونین کے پارٹی ترجمان پراودا اور سوویت حکومت کے ترجمان اخبار ازویستیا میں پاکستان سے متعلق جو مقالے شائع ہوتے ہیں ان پر بھی گفتگو ہوئی جن میں پاکستان پر ترہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرنے والے افغان رجعت پسندوں کو امداد فراہم کرنے کے الزامات لگاتے ہوئے خبردار کیا گیا کہ قومی اور مذہبی اختلافات کو ہوا دینے سے پورے علاقے کی صورتحال پر خطرناک اثرات مرتب ہوں گے۔

چنانچہ جنرل ضیاء نے اپنی حکومت کے نکتۂ نظر کے حوالے سے صورتحال کی وضاحت کی اور بیرونی الزامات کی تردید کے لئے پشاور میں اظہار خیال کرنے کا فیصلہ کیا لیکن یہ اظہار خیال بھی صرف سرکاری اخبار نویسوں کے سامنے کیا گیا۔ جنرل ضیاء نے اس موقع پر اعلان کیا کہ پاکستان نے افغان پناہ گزینوں کو کسی قسم کی تربیتی سہولت فراہم نہیں کی ہے اور ہم افغانستان کے ساتھ اچھے پڑوسیوں جیسے تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ افغان پناہ گزینوں کو پاکستان کی سرزمین سے کسی ایسی سرگرمی کی اجازت نہیں دی جائے گی جس کا افغانستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔

ایک طرف جنرل ضیاء پشاور ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں یہ اعلان کر رہے تھے اور دوسری طرف ایئرپورٹ سے صرف تین میل دور پشاور پریس کلب میں نام نہاد افغان مجاہدین اسلام کے رہنما مولوی محمد نبی محمدی صدر نور محمد ترہ کی کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ان "کارناموں" کی تفصیلات بیان کر رہے تھے جو ان کی تنظیم حرکت اسلامی افغانستان کی قیادت میں افغان ہمگردوں، اٹھائی گیروں، خوانین اور لٹیروں کے جتھوں نے انجام دیئے تھے۔ مولوی محمد نبی محمدی بڑک مار رہے تھے کہ ان کے "مجاہدین" نے پورے ہرات کو "فتح" کر لیا ہے۔ دو گورنروں کو ہلاک کر ڈالا ہے اور طیارہ شکن یونٹوں کو قبضہ میں لے لیا ہے۔ موصوف نے پریس کانفرنس میں تین بھگوڑوں کو بھی متعارف کرایا اور انہیں افغان فوج کے افسر بتایا۔ اس سے اگلے دن اخبار نویسوں کو ایک نام نہاد افغان محاذ آزادی کے قیام کا مژدہ سنایا گیا۔ اس محاذ کی طرف سے جس کے متعلق کہا گیا کہ اس میں افغانستان کی حکومت کے خلاف برسرپیکار تمام گروپ شامل ہیں۔ اخبار نویسوں کو دعوت دی گئی کہ وہ اس کے ہیڈ کوارٹر آئیں جہاں محاذ کے سربراہ صبغت اللہ مجددی پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے۔

بھگوڑوں کی دیدہ دلیری ملاحظہ ہو کہ پاکستان میں اپنی تنظیموں کے ہیڈ کوارٹر ہونے کے کھلم کھلا اعلانات کرتے ہیں اور تحریری دعوت ناموں کے ذریعہ اخبار نویسوں کو اپنے "ہیڈ کوارٹر" میں مدعو کرتے ہیں۔ تاہم دعوت ناموں میں جو انتہائی اعلیٰ کاغذ پر چھپے ہوئے لیٹر پیڈ پر ٹائپ شدہ تھے، اتنی احتیاط برتی گئی تھی کہ "ہیڈ کوارٹر" کی جائے وقوع ظاہر نہیں کی گئی تھی اور اس بارے میں زبانی معلومات فراہم کرنے کا فریضہ دعوت نامے تقسیم کرنے پر مامور شخص نے انجام دیا بعد ازاں نامعلوم وجوہ کی بناء پر پشاور میں یہ پریس کانفرنس منسوخ ہو گئی اور صبغت اللہ مجددی صاحب نے راولپنڈی کے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں ملکی اور غیر ملکی اخبار نویسوں سے خطاب کیا۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ایک طرف جنرل ضیاء پاکستان کی سرزمین کو افغانستان کے خلاف کسی سرگرمی کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہ دینے کا اعلان کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھگوڑے افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی تختۂ مشق بنانے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

صوبہ سرحد کے عوام خاص طور پر قبائلی باشندوں میں افغان بھگوڑوں کی سرگرمیوں پر سخت ناپسندیدگی ظاہر کی جا رہی ہے۔ افغان سرحد سے متصل بعض قبائلی علاقوں میں پچھلے دنوں جو واقعات پیش آئے ہیں ان کی وجہ سے عوام کی فکرمندی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے اور وہ یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ پاکستان کی سالمیت اور بقاء کی خاطر مزید بھگوڑوں کی آمد روکنے کے لئے سرحد بند کر دی جائے۔ عوام حکومت سے اس نیم مذہبی نیم سیاسی جماعت کی گوشمالی کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں جو افغان بھگوڑوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر کے ملک کے لئے مشکلات کا سبب بن رہی ہے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جماعت نے احیائے اسلام کی عالمگیر تحریک کی آڑ میں اسلام کے نام پر دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں کھلم کھلا مداخلت کو عین فریضۂ اسلامی قرار دینے کی جو نئی روش اختیار کی ہے وہ ملک کی سالمیت، یکجہتی اور استحکام کے لئے انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے لہٰذا قبل اس کے کہ پانی سر سے گزر جائے اس پارٹی کی سرگرمیوں کو لگام دی جائے۔ *

وہ کافر و ظالم ہیں

قاتلوں میں شمار ہوں گے

اسلام میں وعدہ معاف گواہ کی شہادت کی گنجائش نہیں!

صورت مسئولہ میں جس خصوصی مقدمہ قتل کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک جزوی واقعہ ہے جس پہ اظہار رائے سے یہ بہتر ہے کہ کلی اور اصولی طور پر شریعت اسلامیہ کے ضابطہ عدل کو بیان کر دیا جائے۔

۱۔ اسلام کی نظر میں حکومت کی غرض و غایت اور اصل روح قیام عدل ہے چنانچہ سنہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد عین جوف کعبہ میں اسی روز یہ آیت نازل ہوئی جس دن اسلام کو اقتدار ملا۔

مولانا احتشام الحق تھانوی

ان اللہ یامرکم ان تؤدّوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین النّاس ان تحکموا بالعدل۔

پارہ ۵ سورت ۴ رکوع ۵۔

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچا دو اور جب لوگوں میں فیصلہ دو تو عدل کے ساتھ دو۔

امام قرطبی نے اپنی کتاب الجامع لاحکام القرآن میں اس آیت کو "اسلامی حکومت کی اساس" قرار دیا ہے اور صاحب تفسیر المنار علامہ رشید رضا نے اس آیت کو "امہات الاحکام" میں شمار کیا ہے۔ دنیا کی تمام حکومتیں اس پر متفق ہیں کہ حکومت کا مقصدِ اوّلین عدل اور انصاف ہی ہے لیکن فی زمانہ عدل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عدل ملکی دوسرا عدلِ الٰہی۔ عدلِ ملکی وہ انصاف اور عدل ہے جو ملک میں رائج الوقت انسانی قوانین اور ضابطوں کے مطابق ہو اور عدلِ الٰہی وہ عدل و انصاف ہے جو قرآن و سنت پر مبنی شرعی قوانین اور طریقوں کے مطابق ہو۔ گویا حقیقی عدل و انصاف وہ ہی ہے جو منصفانہ اور عادلانہ قوانین شریعت کی رو سے حاصل ہو اور انسان کے بنائے ہوئے قوانین جو خود بھی ظالمانہ اور غیر عادلانہ ہوتے ہیں ان کے مطابق فیصلہ بھی ظالمانہ اور غیر عادلانہ ہی ہو سکتا ہے لہٰذا حقیقی انصاف کا حصول صرف عدل الٰہی کے ذریعے

ہی ممکن ہے۔

اسلامی نظام عدل میں دیوانی اور فوجداری کی بنیاد پر مقدمات کی سماعت کے لئے الگ الگ عدالتیں نہیں ہوتیں بلکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بنیاد پر مقدمات کی نوعیتوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ حقوق العباد میں مدعی انسان ہوتا ہے اور حقوق اللہ میں مدعی خود اسلامی حکومت ہوتی ہے چنانچہ قتل عمد رومن اور برطانوی نظام عدل میں فوجداری کا جرم ہے جس میں حکومت مدعی بن جاتی ہے مگر اسلام میں چونکہ قتل سے مقتول کے ورثاء متاثر ہوتے ہیں اس لئے اس جرم کا شمار بھی حقوق العباد میں ہے یعنی مقتول کے ورثا مدعی ہوتے ہیں۔ وہ چاہیں قاتل کو بلا معاوضہ معاف کر دیں چاہیں تو دیت یعنی مالی معاوضہ پر راضی نامہ کر لیں اور یا جان کے بدلے میں جان یعنی قصاص کا مطالبہ کریں۔ قرآن کریم میں ان تینوں صورتوں کا ذکر پارہ ۲ سورہ ۱ رکوع ۶ میں ہے۔

یاایھا الذین امنوا کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ ط الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ ط فمن عفی لہ من اخیہ شیء فاتباع بالمعروف واداء الیہ باحسان ذلک تخفیف من ربکم ورحمۃ ط فمن اعتدیٰ بعد ذلک فلہ عذاب الیم۔

ترجمہ: اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا جاتا ہے مقتولین کے بارے میں۔ آزاد آدمی آزاد آدمی کے عوض میں اور غلام غلام کے عوض میں اور عورت عورت کے عوض میں۔ ہاں جس کو اسکے فریق کی طرف سے کچھ معافی مل جائے تو معقول طور پر مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ ساتھ اس کے پاس پہنچا دینا یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف اور ترحم ہے پھر جو شخص اس کے بعد تعدی کا مرتکب ہو تو اس شخص کو بڑا دردناک عذاب ہوگا۔

اسلام سے قبل یہود کی شریعت موسویہ میں قتل عمد میں قصاص ہی لازمی تھا اور نصاریٰ کی شریعت عیسویہ میں قتل عمد میں صرف دیت لازمی تھی۔ اسلام نے اعتدال کی راہ اختیار کر کے مقتول کے ورثاء پر چھوڑ دیا۔ وہ چاہیں معاف کر دیں، چاہے دیت لے لیں اور یا وہ قصاص کا مطالبہ کریں۔ حاکم یا جج کا ایسا کوئی قدم جو ورثاء کے آزادانہ اختیار میں رکاوٹ ثابت ہو جائے۔ قرآن کریم کی اس آیت کی صریح خلاف ورزی ہوگی جس میں صاف صاف ورثاء کو معافی کا اختیار دیا گیا ہے اور حکام یا جج حضرات کی ایسی کوئی کوشش جس سے قصاص لازم ہو جائے نہ صرف یہ کہ قرآن کی دی ہوئی رعایت کو چھوڑ کر یہود کی شریعت کو اختیار کرنے کے مترادف ہے بلکہ حدود و قصاص کے بارے اسلام کے اس ضابطۂ عدل کے بھی خلاف ہے جس میں حدود و قصاص کو ٹالنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲ : جب مقتول کے ورثاء کی طرف سے قاضی کی عدالت میں کسی کے خلاف قتل عمد کا مقدمہ دائر کیا جائے تو قاضی سب سے پہلے مدعی سے بینہ یعنی دو عادل شاہدوں کی عینی شہادت طلب کرے گا۔ گواہ مسلمان، عاقل بالغ ہوں۔ فواحش و منکرات اور جھوٹ بولنے میں ملوث نہ ہوں۔ مدعی کے رشتہ دار یا مدعا علیہ کے دشمن نہ ہوں۔ مدعی کے دباؤ میں نہ ہوں۔ مدعی سے کسی قسم کا معاوضہ نہ لیا ہو۔ یہ تمام شرطیں اسلامی قانون کی کتاب ہدایہ، شامی اور فتاویٰ عالمگیری میں موجود ہیں۔ اگر مدعی ایسی دو عینی شہادتیں مہیا کر دیتا ہے تو قاضی کو چاہیے کہ وہ گواہوں کے بارے میں اپنے طور پر تحقیق کرے جس کو اسلامی قانون کی زبان میں تزکیہ اور تعدیل کہتے ہیں۔ اس تحقیق کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ممکن ہے تحقیق میں کوئی ایسا نکتہ نکل آئے جس سے شہادت معیاری نہ رہے اور قصاص کو ٹالا جا سکے جو شریعت کا مقصود ہے۔ پھر تحقیق کے باوجود اگر دو شہادتیں معیاری ہیں تو قاضی مدعی کے حق میں اس طرح فیصلہ دے گا کہ جرم ثابت ہو گیا۔ مقتول کے ورثا سے پوچھا جائے وہ تینوں مذکورہ امور میں سے کیا چاہتے ہیں اور اگر وہ ایسی عینی شہادتیں پیش نہ کر سکے تو مدعا علیہ سے قسم لی جائے گی کہ اس نے یہ جرم نہیں کیا، اگر قسم کھالی تو مدعا علیہ بری ہو جائے گا۔ رائج الوقت انگریزوں کے نظام عدل کے مطابق کسی اقبالی مجرم کو وعدہ معاف گواہ بنانا اور فرضی و بوگس شہادت مہیا کرنا عدل کے نام پر انصاف کا خون کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ظلم بالائے ظلم بھی ہے۔ اقرار اقبالی مجرم کے حق میں مضبوط حجت ہے قتل عمد میں اقبالی ملزم کو معاف کرنے کا حق سوائے ورثاء کے کسی جج اور کسی حاکم کو نہیں پہنچتا پھر اقرار جرم اقبالی مجرم کے اپنے حق میں مؤثر ہے۔ دوسرے کے حق میں مؤثر نہیں ہے۔ حدیث میں ہے **المرء یؤخذ باقرارہ** پھر اقبالی مجرم جو فاسق ہے اور قابل شہادت نہیں اس کو معافی کا لالچ دے کر کسی دوسرے کے خلاف گواہ قرار دینا، لالچ و خوف یا اجرت کی گواہی ہے جو کسی طرح شہادت نہیں ہے بلکہ وعدہ معاف گواہ کا کسی کے خلاف قتل کا الزام بھی مستقل دعویٰ ہے جس پر حجت اور بیّنہ کی ضرورت ہے ایسے مجرم، وعدہ معاف گواہ کی مجروح شہادت پر کسی کے خلاف فیصلہ دینا دیدہ و دانستہ مجرم کو بخش دینے اور غیر مجرم کو مجرم قرار دینے کے مترادف ہے۔ پھر اسلام کے نظام عدل کی روح یہ ہے کہ حدود و قصاص کو ٹالنے کا انداز اختیار کیا جائے۔ اس میں فرضی اور بوگس شہادت کو مہیا کر کے قصاص کو ناگزیر بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وعدہ معاف گواہ کی شہادت کو قبول کر کے کسی کے خلاف قصاص کا فیصلہ دینے والے قاضی کا فیصلہ ناقابل نفاذ ہے۔ فقہ اسلامی کی مشہور کتاب ہدایہ میں فیصلے کی نوعیت اور اس کے عدم اجراء سے متعلق امام محمد کا قول اور اس پر دوسرے فقہا کا استحسان نقل کیا گیا ہے

اذ قال القاضی تصنیت علی ھذا بالرجم فارجمہ او بالقطع فاقطعہ او بالضرب فاضربہ لا تاخذ بقولہ حتیٰ یبین الحجۃ واستحسن المشائخ ھذا الروایۃ لفساد الحال فی اکثر القضاۃ۔

ترجمہ: جب قاضی اجراء سزا کے ذمہ دار سے کہے کہ میں نے اس کے خلاف سنگساری کا فیصلہ دے دیا ہے تو اسے سنگسار کر دے یا ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ دے دیا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دے یا کوڑے مارنے کا فیصلہ دے دیا ہے تو کوڑے مار دے تو اس کے قول کو قبول نہ کرے جب تک کہ یہ جائزہ نہ لے لیا جائے کہ فیصلہ حجت پر مبنی ہے۔ مشائخ نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے بوجہ بگاڑ پیدا ہونے کے اکثر قاضیوں میں۔

اپیل کے بارے میں بھی توثیق و تنسیخ سے پہلے یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ فیصلے میں اسلام کے ضابطۂ عدل اور طریق کار پر عملدرآمد ہوا ہے یا نہیں۔ ہدایہ میں ہے۔

اذا رفع الی القاضی حکم حاکم امضاہ الا ان یخالف الکتاب والسنۃ کما اذا قضی بشاھد واحد مع یمین المدعی حیث یخالف قولہ تعالیٰ فاستشھدوا شھیدین من رجالکم لایجوز امضائہ۔

ترجمہ: جب کسی حاکم کے خلاف قاضی کے پاس اس بات کی اپیل کی جائے کہ اس نے کتاب و سنت کے خلاف کیا ہے جیسے ایک گواہ پر مع مدعی کے حلف کے فیصلہ دے دیا ہو جو کہ اللہ تعالیٰ کے اس کے قول کے خلاف ہے کہ گواہ لاؤ دو دو تم میں سے تو اس کا نفاذ جائز نہیں ہے۔

قرآن و سنت کی مذکورہ بالا تصریحات کے باوجود اگر کوئی حاکم یا جج قوانین شریعت کو نظر انداز کر کے رائج الوقت غیر اسلامی رومن نظام عدل پر عملدرآمد کرتا ہے وہ قرآن کریم کی آیت

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون ھم الظالمین ۔ پارہ ۶ سورت مائدہ

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ دیں وہ کافر اور ظالم ہیں۔

کے بموجب کافر و ظالم ہوگا اور اللہ کے ہاں قاتلوں میں اس کا شمار ہوگا۔ ✱

انجام کچھ ہو، وقت کے چیلنج کا مقابلہ جرأت اور پامردی سے کرو

میر مرتضیٰ بھٹو کے نام
جناب بھٹو کا خط

ہوسکتا ہے کہ یہ خط جو سابق صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے موت کی کوٹھری سے اپنے بڑے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو کے نام لکھا ہے، میر مرتضیٰ کے نام ان کا آخری خط ثابت ہو. کیونکہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست مسترد کردی ہے. قانونی جنگ ختم ہوچکی ہے. اب صرف رحم کی گنجائش باقی ہے لیکن مسٹر بھٹو کہہ چکے ہیں کہ وہ رحم کی درخواست نہیں کریں گے. کیونکہ وہ بے گناہ ہیں، اور رحم کی درخواست کرنے کی بجائے تختۂ دار پر چڑھنا پسند کریں گے. دوسری جانب فوجی حکومت کے سربراہ جنرل ضیاؔ متعدد بار اعلان کرچکے ہیں کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد کریں گے. شاید مسٹر بھٹو نے بھی یہ خط "آخری خط" سمجھ کر لکھا ہے. کیونکہ اس میں میر مرتضیٰ کو خاندانی روایات اور ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے. اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرنے کی ہدایت کی ہے اور کہا ہے کہ "انجام خواہ کچھ ہو وقت کا چیلنج پامردی اور جرأت سے کیا جائے."

مسٹر بھٹو کو اب کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے. اور یہ معجزہ لندن میں مقیم اور آکسفورڈ کے فارغ التحصیل ۲۴ سالہ میر مرتضیٰ بھٹو، ہی انجام دے سکتے ہیں کہ بیرونی دنیا سے موثر اور طاقتور دباؤ ڈلوائیں. گذشتہ گیارہ ماہ کے دوران مرتضیٰ بھٹو نے اپنے والد کو بچانے اور ان کے لئے صدورِ مملکت اور سربراہانِ حکومت کی حمایت حاصل کرنے کے لئے تقریباً پوری دنیا کا دورہ کیا. یہ اُن کی انتھک کوشش کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم کالاہان، برطانوی پارلیمان، امریکی صدر جمی کارٹر، یورپ کے دیگر سربراہوں نے جنرل ضیاؔ سے مسٹر بھٹو کی سزائے موت منسوخ کرنے کی اپیل کی ہے میر مرتضیٰ جب سے لندن آئے، پاکستان کی فوجی حکومت کی جانب سے ان پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ اپنے والد کو بچانے کی مہم بند کردیں. میر مرتضیٰ نے پاکستان کی قومی ایئرکمپنی پی آئی اے میں سفر کرنا ترک کردیا ہے کیونکہ پی آئی اے کے ہوابازوں اور اسٹاف کو فوجی حکومت نے ہدایت کی ہے کہ اگر مرتضیٰ بھٹو پی آئی اے کے طیارے میں سوار ہوں تو انہیں گرفتار کرکے پاکستان پہنچا دیا جائے. میر مرتضیٰ کو اپنی جان کا بھی خطرہ ہے اس لئے وہ لندن میں ایک ہی مکان میں قیام نہیں کرتے، اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں ______ ادارہ

میرے پیارے میر!

یہ پہلی مرتبہ نہیں کہ میں نے تمہیں خط لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہو. اس سے قبل کئی مرتبہ میں نے خط لکھنے کا ارادہ کیا، قلم اٹھایا لیکن ذہنی یکسوئی نہ ہونے کے سبب نہ لکھ سکا اور ہر مرتبہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا. کیونکہ مجھ پر قتل کا مقدمہ چلایا گیا ہے. اور میں کال کوٹھری میں بند ہوں. ایسی صورتِ حال میں کس مُنہ سے اپنے بڑے بیٹے کو خط لکھ سکتا ہوں؟

ہم سب جانتے ہیں کہ میں بے گناہ ہوں اور یہ بھی ہم سب جانتے ہیں کہ میں گہری اور ذلیل سازش کا شکار ہوا ہوں لیکن اس کے باوجود جو تذلیل اور ذلّت کی گئی ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا.

یہی وہ وجہ ہے کہ میں اپنے بڑے بیٹے کو خط لکھنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ ہوسکا. میرا پیارا بڑا بیٹا.

ایک ایسا نوجوان جو میرا "چوغہ" زیب تن کرے گا. اور جس کے پاس میری نشانیاں ہونگیں.

کچھ عرصہ پہلے میں نے شاہ دشاہ نواز اور صنم کو خط لکھے تھے کیونکہ انہیں لکھنا "نسبتاً" آسان تھا. اگر بے نظیر ملک سے باہر ہوتی تو اسے بھی (مذکورہ بالا سبب) خط لکھنا ایک دشوار گذار کام ہوتا.

بے نظیر — میری بیٹی، بچوں میں سب سے بڑی

میر مرتضیٰ بھٹو لندن میں ایک مظاہرہ سے خطاب کر رہے ہیں

ہے اور تم بڑے بیٹے ہو۔ چنانچہ تم دونوں اور دو دوسرے دو چھوٹے بچوں میں یہ فرق ہے کہ وہ میری اور ممی کی طرح بوڑھے ہونے کے بعد بھی ہمارے لئے چھوٹے ہی رہیں گے۔

صنم بہت ہی حساس لڑکی ہے اور میں صرف اُمید ہی کر سکتا ہوں کہ اخبارات کی چند رپورٹیں یا بعض حرکات اس کے احساسات کو مجروح نہیں کریں گی ایک زمانے میں میں چاہتا تھا کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ آیا اُسے ہارورڈ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن واپس آنا چاہیئے یا مزید تعلیم کے لئے آکسفورڈ چلا جانا چاہیئے لیکن اب یہاں کی صورتِ حال کے پیشِ نظر بہتر ہوگا کہ وہ آکسفورڈ چلی جائے۔ وہ بہت ہی لاپرواہ لڑکی ہے۔ اس لئے تمہیں آکسفورڈ میں اسے داخلہ دلانے میں مدد کرنی ہوگی۔

بے نظیر سے بھی اس کی مدد کے لئے کہہ سکتا تھا لیکن وہ بیچاری لڑکی پہلے ہی مسائل، پریشانیوں اور کام میں گردن تک دھنسی ہوئی ہے۔

مجھے ابھی تک علم نہیں کہ شاہ (شاہ نواز) کیا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی ماں پر زیادہ اعتماد کرتا ہے۔ بہر حال تم اس کے نزدیک ہو اور مجھے یقین ہے کہ اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کر رہے ہوگے۔ جب کبھی اُس سے ملو، براہِ مہربانی اس کی سوچ کو صحیح سمت میں استوار کرنے کی کوشش کرنا۔ وہ بہت اسمارٹ اور ذہین ہے لیکن بعض اوقات عجیب و غریب نظریات اس کے ذہن پر مسلط ہو جاتے ہیں اس کی وجہ بتانا مشکل ہے کیونکہ جب خود میں اس کی عمر کا تھا، تو میں بھی ایسے ہی نظریات کا مالک تھا۔ تم سب نے بڑی یا چھوٹی ڈگریاں حاصل کرلی ہیں اور تم سب کی رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے۔ لیکن شاہ (شاہ نواز) پر میرے نظریات اور رجحانات کی چھاپ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔

گذشتہ گرما میں جب تم یہاں تھے تو تم نے نہایت عظیم الشان کارنامے انجام دیئے تھے، تم میرے لئے طاقت اور حوصلے کا ایک ذریعہ تھے۔ عوام نے تمہیں اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کو لیا جاتا ہے۔ تمہاری کارکردگی نے مجھے ناقابلِ یقین حد تک پُرجوش بنا دیا تھا۔ جو خوشی اور راحت مجھے محسوس ہوئی اس کی کیفیت ناقابلِ بیان ہے اور یہ امر بھی نہایت اطمینان بخش ہے کہ عوام تمہیں یاد کرتے ہیں، تمہاری عدم موجودگی کو بُری طرح محسوس کرتے ہیں۔ اور انہیں احساس ہے کہ تمہیں مسائل کے انبار سے واسطہ پڑا ہے۔

میرا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ میں نے ملک کے استحصال زدہ اور کچلے ہوئے غریب عوام کو بیدار کیا، انہیں امورِ مملکت میں رائے دینے کا حق دیا میں نے انہیں ۱۹۷۱ء کی شرمناک ذلت کی گہرائیوں سے نکالا اور ان کے وقار کو بحال کیا۔

اہم بات یہ ہے کہ وقت گذر جائے گا لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہمیں اس سے عزت اور وقار کے ساتھ گذرنا ہے۔ انجام خواہ کچھ ہو، وقت کے چیلنج کا مقابلہ جرأت اور پامردی سے کیا جائے۔

موجودہ بحران، ان بحرانوں میں سے بدترین ہے جو ہم نے دیکھے ہیں، تمہاری والدہ اور تمہاری بہن حوصلہ مندی اور طاقت کے روشن مینار ہیں۔ ان کی عظیم الشان اور جرأت مندانہ امداد کے بغیر یہ بہت مشکل ہوتا بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ناممکن ہوتا۔

یہاں . . . . اور انتظامیہ میں انصاف نہیں ہے، صرف خدائے بزرگ و برتر اور عوام ہی مجھے بچا سکتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بیرونی اثر و رسوخ اور دباؤ فضول اور بیکار ہے۔ بیرونی دباؤ اسی وقت ہی موثر اور کارآمد ہوتا ہے جب اسے صحیح مقامات پر ڈالا جائے۔ مثال کے طور پر بیرونی پریس ایک تعمیری کردار ادا کر سکتا ہے۔ حکومت اور پارلیمان کے با اثر افراد امداد کر سکتے ہیں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی انگلیاں صحیح اور حساس پہلوؤں پر رکھنی چاہئیں اور اپنی طاقت فضول ضائع نہیں کرنی چاہیئے۔

مجھے امید ہے کہ تم اپنا خیال رکھ رہے ہوگے اور اچھے دوست بنا رہے ہوگے۔

خدا تم پر رحمتیں نازل کرے

انتہائی پیارے اور محبوب بیٹے!

تمہارا باپ

ذوالفقار علی

*

اپنی اہلیہ نصرت بھٹو اور بچوں کے ہمراہ (۱۹۷۰ء)

بھٹو

کو پھانسی دی گئی تو کیا ہوگا؟

شوکت صدیقی

ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو کیا ہوگا؟ یہ ایسا اہم سوال ہے جو آج نہ صرف پاکستان کے گوشے گوشے میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی نہایت شدومد کے ساتھ زیرِ بحث ہے۔ بھٹو نے جیل کی کال کوٹھری سے دعویٰ کیا ہے کہ اگر انہیں پھانسی دی گئی تو ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ملبے کا ڈھیر بن جائے گا۔ ختم ہو جائے گا، بھٹو کے اس دعوے کی تائید بیرونی اخبارات و جرائد اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے تبصروں اور سیاسی تجزیوں سے بھی ہوتی ہے۔ غیر ملکی سربراہانِ مملکت اور سیاسی رہنماؤں نے بھی، جنہوں نے بھٹو کی جاں بخشی کے لئے رحم کی اپیل کی ہے، پاکستان کے مستقبل کے بارے میں ایسے ہی اندیشوں کا برملا اظہار کیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا بھٹو اور پاکستان ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں؟ کیا پاکستان کی بقا کا انحصار بھٹو کی زندگی اور موت پر ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بھٹو معاشرے کے ایک فرد کا نام ہے۔ اور معاشرے کے کسی ایک فرد کی موت سے ملک کا مستقبل کیسے متاثر ہو سکتا ہے؟ لیکن معاشرے کا کوئی فرد اپنی ذات میں فردِ واحد نہیں ہوتا۔ وہ معاشرے میں مختلف سماجی رشتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ خاندان کے رشتے سے، برادری کے رشتے سے، قبیلے کے رشتے سے، طبقاتی رشتے سیاسی رشتے سے، معاشرے میں جو فرد جتنا اہم مقام رکھتا ہے، وہ اپنے سماجی رشتے کے پسِ منظر کے ساتھ اتنا ہی منفرد اور نمایاں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی زندگی میں ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے، جب وہ اپنے مخصوص سماجی رشتوں کی بنیاد پر معاشرے میں ایک علامت کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی عظمت اور بڑائی کا یہی راز ہوتا ہے

ذوالفقار علی بھٹو ایک سیاسی رہنما ہیں۔ وہ معاشرے میں اسی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ کیا وہ اتنے عظیم رہنما ہیں کہ ان کی زندگی کے ساتھ پاکستان کی زندگی کا چراغ گُل ہو سکتا ہے؟ قائداعظم محمد علی جناح بہت عظیم رہنما تھے۔ مگر ان کے انتقال کے بعد پاکستان ختم نہ ہوا، برقرار رہا۔ ان کے جانشین لیاقت علی خاں بھی بہت بڑے رہنما تھے۔ وہ قتل کر دیئے گئے۔ مگر پاکستان قتل نہ ہوا۔ زندہ رہا۔ موجود رہا۔ پھر بھٹو کے ساتھ یہ تخصیص کیوں ہے؟ کیا وہ قائداعظم اور لیاقت علی خاں سے زیادہ بڑے سیاسی رہنما ہیں؟ اس کا حقیقت پسندانہ

نوکر شاہی اور قومی اتحاد کے رہنما نوشتۂ دیوار پڑھ لیں

جواب یہ ہے کہ ہر سیاسی رہنما کی عظمت اور اہمیت کا تعین اس کے عہد کے معروضی حالات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ کسی ایک عہد کے رہنما کو دوسرے عہد کے لئے بطور سند یا مثال نہیں پیش کیا جاسکتا۔ اور اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ معروضی حالات کی تبدیلی کے ساتھ سیاسی رہنماؤں کی عظمت اور اہمیّت کا معیار بدل جاتا ہے۔

قائد اعظم اور لیاقت علی خاں کے عہد کے معروضی حالات یہ تھے کہ پاکستان نیا نیا قائم ہوا تھا۔ عوام کے دلوں میں زبردست جوش و جذبہ تھا۔ وہ اسے متحد اور مستحکم دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کی سالمیت اور استحکام کو اور اس کی ترقی اور خوشحالی کو اپنی فلاح و بہبود اور اپنی ترقی اور خوشحالی کی ضمانت سمجھتے تھے۔ قائد اعظم اور لیاقت علی خاں کا عہدِ حکومت بہت مختصر بھی تھا۔ وہ اس دنیا سے سدھار گئے تو نوکر شاہی کے کارندوں غلام محمد، مشتاق احمد گورمانی، اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی نے اقتدارِ مملکت پر شب خون مارا اور ایوانِ حکومت پر قابض ہوگئے۔ یہ عوام کو ان کے اقتصادی، سماجی اور جمہوری حقوق سے محروم کرنے کی سازش تھی۔ یہ برطانوی سامراج کی پروردہ نوآبادیاتی نوکر شاہی اور برطانوی سامراج ہی کے پروردہ جاگیردار طبقہ کا گٹھ جوڑ تھا۔ اس سازش کے پس پردہ چودھری محمد علی کا ذہن کام کر رہا تھا، جو جوڑ توڑ کے ماہر کی حیثیت سے برطانوی ہند کے مرکزی سکریٹریٹ میں پہلے ہی خاصی شہرت رکھتے تھے۔ اور نوآبادیاتی نوکر شاہی کے "جالندھری گروپ" کے روح رواں سمجھے جاتے تھے۔

نوکر شاہی کے اقتدار کا یہ دور ۱۹۵۸ء تک چلتا رہا۔ سول نوکر شاہی کی گرفت اقتدارِ مملکت پر جب کمزور ہوگئی تو فوجی نوکر شاہی کے کارندہ ایوب خاں نے اس کی مدد کے لئے چور دروازے سے ایوانِ حکومت میں داخل ہوکر اقتدار کی باگ ڈور سنبھال لی۔ نوکر شاہی کی حکمرانی کا یہ سلسلہ جنرل یحییٰ خاں کے زوال تک چلتا رہا۔ اس مرحلہ تک پہنچتے پہنچتے ایک گماشتہ سرمایہ دار طبقہ پیدا ہوچکا تھا۔ وہ بھی اقتدارِ مملکت میں نوکر شاہی اور جاگیردار طبقہ کے ساتھ اقتدار میں شریک ہوگیا۔ اسی صورتِ حال سے عوام میں مایوسی اور بددلی پھیلی۔ بدلتے ہوئے معروضی حالات کے نتیجے میں ان کی فکر اور سوچ میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ انہوں نے دیکھا کہ ملک کی سالمیت اور استحکام کا مطلب نوکر شاہی اور اس کے حلیف استحصالی طبقات کے اقتدار کی سالمیت اور استحکام تھا۔ اس کے مفادات کا تحفظ تھا۔ چنانچہ عوام کو سالمیت اور استحکام کا نعرہ بھی اقتصادی اور سیاسی استحصال کا ایک حربہ نظر آنے لگا۔ اس نئی فکر نے علیحدگی پسندی کی تحریکوں کو جنم دیا۔

علیحدگی پسندوں کو غدّار اور علیحدگی پسندی کو گردن زدنی تو قرار دیا جاتا ہے مگر یہ سوچنے اور سمجھنے کی مطلق زحمت گوارہ نہ کی گئی کہ علیحدگی پسندی ہوتی کیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس رجحان کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جاتا اور اس تجزیہ کی روشنی میں مناسب حل تلاش کیا جاتا۔ مگر ایسا نہ کیا گیا۔ اسے جبر و تشدد سے دبانے کی کوشش کی گئی حتیٰ کہ توپ و تفنگ اور لشکر کشی کے استعمال سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ انجام کار مشرقی پاکستان مرحوم و مغفور ہوا اور بنگلہ دیش دنیا کے نقشہ پر ایک نئی مملکت کے روپ میں نمودار ہوا۔ یہ بنگلہ دیش ان ہی بنگالی مسلمانوں نے پاکستان کو دو لخت کرکے بنایا تھا۔ جنہوں نے دسمبر ۱۹۴۵ء کے تاریخی انتخابات میں قیامِ پاکستان کے حق میں ۹۸ فیصد سے زائد ووٹ دیئے تھے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان یعنی موجودہ پاکستان کے مسلمانوں نے اسی انتخاب میں پاکستان کے حق میں صرف ۵۰.۶۸ فیصد ووٹ ڈالے تھے۔

بنگالی مسلمانوں نے علیحدگی پسندی کا راستہ کیوں اختیار کیا۔ اسے اپنی آزادی اور نجات کا وسیلہ کیوں سمجھا؟ علیحدگی پسندی بھی بنیادی طور پر طبقاتی جدوجہد کی ایک شکل ہوتی ہے۔ یہ استحصال کرنے والے علاقے کے خلاف استحصال زدہ علاقے کے عوام کی جدوجہد ہوتی ہے۔ تحریکِ پاکستان بھی آخری تجزیہ میں علیحدگی پسندی تھی۔ اور کشمیری عوام کی جدوجہد بھی علیحدگی پسندی کی تحریک ہے، اسے قوموں اور قومیتوں کا حقِ خود اختیاری بھی کہا جاتا ہے، یہ علیحدگی پسندی کی شکل اس وقت اختیار کرتی ہے، جب کسی علاقے کے عوام کو ان کے اقتصادی، سماجی، اور ثقافتی حقوق سے جبر و تشدد کے بل بوتے پر محروم کر دیا جاتا ہے اور عوام کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے، بات تلخ تو ہے مگر یہ ایک معروضی حقیقت ہے اور کوئی بھی معروضی حقیقت خواہشات سے نہیں بدلتی۔ بُرا کہنے اور چراغ پا ہونے سے بھی اسے نہیں بدلا جاسکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے آزادی تو حاصل کرلی، مگر آزادی کا مفہوم نہ سمجھا۔ آزادی کا مطلب ہے، فرد کا حق خود ارادی، فرد کے حق خود ارادی کا مطلب ہے معاشرے کا اجتماعی حق خود ارادی۔ معاشرے کے اجتماعی خود ارادی کا مطلب ہے سوادِ اعظم کا حق خود ارادی، سوادِ اعظم کا مطلب ہے محنت کش عوام، یعنی ۹۵ فیصد کسان، مزدور اور دوسرے پسماندہ طبقات۔

بدقسمتی سے جنرل یحییٰ خاں کے عہدِ حکمرانی تک جو نوکر شاہی اقتدار پر قابض رہی، اس کی بھاری اکثریت کا تعلق پنجاب سے تھا یا مہاجرین سے، بنگالی مسلمان اپنی اکثریت کے باوجود نوکر شاہی اور اس کے حلیف حکمران طبقات میں نہ ہونے کے برابر تھے لہٰذا بنگالیوں میں علیحدگی پسندی کی تحریک ابھری اور اس کی نفرت کا نشانہ پنجاب اور مہاجرین بنے۔ اور اسی نفرت کے نتیجے میں بہاری، جو مہاجر ہی ہیں، بنگلہ دیش میں آج بھی راندۂ درگاہ ہیں۔ وطن میں رہ کر بھی بے وطن ہیں۔

مشرقی پاکستان علیحدہ ہوکر بنگلہ دیش بن گیا، مگر علیحدگی پسندی کا رجحان ختم نہ ہوا۔ بلکہ اب زیادہ شدید صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقتصادی اور سماجی حالات نہ بدلے۔ ملک ایک بار پھر اس دور میں پہنچ چکا ہے، جو غلام محمد سے یحییٰ خاں تک کا عہدِ حکمرانی کہلاتا ہے۔ چنانچہ جب عطاء اللہ مینگل یہ کہتے ہیں کہ پنجاب نے بلوچوں کے سیاسی اور اقتصادی حقوق کے ساتھ ساتھ حُبّ الوطنی کا حق بھی اپنے نام الاٹ کرا لیا ہے، تو ان کی آواز پورے بلوچستان کی آواز بن جاتی ہے اسی طرح غوث بخش بزنجو، قومیتوں کے حقِ خود ارادی کی بات کرتے ہیں، تو بلوچستان، سندھ اور سرحد سے اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ ان کی مخالفت میں صرف پنجاب سے آواز اٹھتی ہے، یا ملکی سالمیت کے سب سے بڑے دعویدار مہاجر چپڑقناتیے پھر پھر کرتے ہیں۔

حنیف رامے اور میاں محمود علی قصوری، جب پنجاب کے دفاع میں یہ کہتے ہیں کہ پنجاب کے عوام بھی

بھٹو شام کے صدر حافظ الاسد کے ساتھ

دوسرے صوبوں کے عوام کی طرح، استحصال زدہ اور پسماندہ ہیں، تو بلوچستان، سندھ اور سرحد سے جواب دیا جاتا ہے کہ نوکر شاہی اور دوسرے حکمران طبقات کی لوٹ کھسوٹ کے ذریعے جو دولت پنجاب پہنچتی ہے، وہ کسی نہ کسی شکل میں پنجاب کے عوام کے حصے میں بھی آتی ہے۔ بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ سرحد کا تو حکمران طبقات میں تھوڑا بہت حصہ بھی ہے، مگر بلوچستان اور سندھ تو بالکل محروم ہیں۔ نوکر شاہی، جاگیردار اور سرمایہ دار طبقات میں ان کی کوئی نمائندگی نہیں، اور یہی حکمران طبقات بھی ہیں۔

بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی کے عہدِ اقتدار کے دوران، سندھ میں علیحدگی پسندی کا رجحان ختم ہو گیا تھا یا دب گیا تھا سندھی یہ سمجھنے لگے تھے کہ اقتدارِ مملکت میں انہیں بھی نمائندگی حاصل ہے۔ وہ بھی اس میں حصے دار شریک ہیں۔ بھٹو کے زوال کے بعد وہ شدید احساسِ محرومی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ انجام کار علیحدگی پسندی کا رجحان شدت کے ساتھ ابھر رہا ہے۔ بھٹو کو سزائے موت دے کر عدلیہ نے عدل و انصاف کا حق ادا کر دیا۔ مگر آج سندھ کے ہر گھر میں صفِ ماتم بچھی ہے۔ ہر سندھی کے دل میں ایک بھٹو موجود ہے، جسے وہ اپنا رہبر اور نجات دہندہ سمجھتا ہے۔

عالم یہ ہے کہ بھٹو کے غم میں سندھیوں کی روتے روتے آنکھیں سوجھ گئی ہیں، بلوچ ساکت ہیں، پٹھان دم بخود ہیں۔ ویسے عوام کی بھاری اکثریت خواہ وہ سندھ کی ہو، پنجاب کی ہو، سرحد یا بلوچستان کی ہو، بھٹو سے محبت کرتی ہے۔ عقیدت رکھتی ہے بھٹو بہر حال عوام کے منتخب نمائندے تھے۔ وہ عوام پر مسلط نہیں کئے گئے۔ وہ ۱۹۶۸ء کی عوامی جدوجہد کے عمل میں ایک قومی رہنما کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ انہوں نے عوام کو نیا سیاسی شعور دیا اور استحصالی طبقات کے خلاف جدوجہد کرنے کا حوصلہ دیا۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ بھٹو کو پھانسی دینے کے حق میں جو بھی آواز بلند ہو رہی ہے وہ پنجاب سے اٹھتی ہے یا اس کے ساتھ سر میں سر ملا کر جماعت اسلامی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر مہاجر ہمنوائی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اس کے ردِ عمل میں نفرت کا جو طوفان اٹھ رہا ہے، وہ سروں پر منڈلانے والے خطرات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ نجی محفلوں میں یہاں تک کہ کوچہ و بازار میں کہا جا رہا ہے اور برملا کہا جا رہا ہے کہ لیاقت علی کو قتل کیا جاتا ہے، تو راولپنڈی میں ان کی قتل گاہ تیار کی جاتی ہے۔ سرحد کے ڈاکٹر خان کے قتل کے لئے لاہور کا انتخاب کیا جاتا ہے حسن ناصر کو قتل کرنے کے لئے کراچی سے لاہور پہنچایا جاتا ہے مجیب الرحمٰن کو پھانسی دینا منظور ہوتا ہے تو انہیں ڈھاکہ سے لائل پور لایا جاتا ہے۔ جام ساقی کو جبر و تشدد کا نشانہ بنانے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے تو انہیں کراچی سے لاہور کے قلعہ میں لا کر رکھا جاتا ہے۔ اور بھٹو کا مقدمہ تو پنجاب کے خلاف بین الاقوامی مقدمہ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ انہیں لاڑکانہ سے لاہور لا کر کوٹ لکھپت جیل میں رکھا جاتا ہے۔ مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ پنجاب ہائی کورٹ کے جو جج انہیں سزا دیتے ہیں، وہ سب پنجابی ہیں سپریم کورٹ کے جو جج بھٹو کی سزائے موت کو بحال رکھتے ہیں وہ بھی پنجابی ہیں، سلطانی گواہ بھی پنجابی ہیں مقتول بھی پنجابی ہے۔ اور وکیل سرکار اعجاز حسین بٹالوی بھی پنجابی ہیں، وہ قانونی موشگافیاں دکھا کر سرحد کے ڈاکٹر خان صاحب کے پنجابی قاتل کو پھانسی کے پھندے سے بری کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور قصور کے محمد احمد خاں کے مقدمۂ قتل میں لاڑکانہ کے ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت دلوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ باتیں کیوں کہی جا رہی ہیں۔ اس طرح کیوں سوچا جا رہا ہے؟ زبانوں پر تالے تو ڈالے جا سکتے ہیں مگر ذہنوں پر پہرے کون بٹھائے گا۔ پنجاب کے خلاف نفرت کا یہ طوفان ہمیں کہاں لے جائے گا۔ سرحد اور بلوچستان میں تو پہلے ہی علیحدگی پسندی کا رجحان موجود تھا۔ اب سندھ بھی اسی ڈگر پر چل رہا ہے مشرقی پاکستان کا المیہ ہمارے سامنے ہے اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ چار ڈویژن فوج لگا کر بھی مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے سے نہ بچایا جا سکا۔

بھٹو کو پھانسی دی گئی تو جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا ہے، آج نہیں تو کل پھٹے گا۔ پھر کیا ہو گا؟ وہی ہو گا جو مشرقی پاکستان میں ہوا۔ مشرق میں ہماری سرحد بھارت سے ملتی ہے۔ اور مغرب میں افغانستان ہے۔ اور دونوں کے ساتھ ہماری محاذ آرائی بھی ہے۔ روسی وزیر اعظم کوسیجن کے دورۂ بھارت کے بعد اس میں ایک نیا موڑ آ گیا ہے۔ میاں طفیل کے ساتھ مفتی محمود کے پیٹ میں بھی افغانستان کے خلاف شدید مروڑ اٹھ رہی ہے۔ اقتدار کے نشے میں انہیں بدہضمی ہو گئی ہے۔

سندھی، بلوچ اور پٹھان کہتے ہیں کہ ملک ٹوٹا تو ان کے پاس کھونے کو دھرا ہی کیا ہے۔ مشرقی پاکستان ٹوٹا تو انہوں نے کیا کھویا۔ ان کا مشرقی پاکستان سے کوئی اقتصادی اور سماجی مفاد ہی وابستہ نہ تھا۔ نہ کارخانوں کی صورت میں وہاں ان کا سرمایہ لگا تھا۔ نہ ان کی وہاں ملازمتیں تھیں۔ اور نہ ہی مشرقی پاکستان کی لوٹ کھسوٹ اور استحصال میں وہ حصہ دار تھے۔ ملک کے ٹوٹنے پھوٹنے کا دھڑکا تو پنجاب کو ہونا چاہیئے یا مہاجرین کو، مہاجرین کو اس مسئلے پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے اور اس لئے غور کرنا چاہیئے کہ مشرقی پاکستان کے خاتمے کے بعد سر چھپانے کو مغربی پاکستان تو موجود تھا۔ اب تو ان کے لئے بقول ایوب خاں صرف بحیرۂ عرب رہ گیا ہے۔ کراچی کو ایک عدد "اسرائیل" بنانے کا خواب بھی محض واہمہ ہے نہ کراچی میں پینے کو پانی ہے اور نہ کھانے کو اناج۔ آسمان سے من و سلوٰی تو اترنے سے رہا۔ بھٹو کو پھانسی دلواؤ، چراغاں کرو، مٹھائیاں تقسیم کرو، اور پھر شیر کے تانڈو پر بھیڑوں کا رقص ہو۔ موت کا نغمہ ہو۔

آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم

عوام کا مقبول ترین رہنما موت

کی کال کوٹھڑی میں کیسے پہنچا

وہاب صدیقی

بھٹو ملکی اور غیر ملکی سازشوں کا نشانہ کیوں بنے؟

"انسان کی عزیز ترین شے اُس کی زندگی ہے لیکن اُسے یہ زندگی ایک ہی مرتبہ ملتی ہے۔ اس لئے اُسے یہ زندگی ایک بے مقصد، بزدلانہ طریقے سے یا اس طرح بسر نہیں کرنا چاہیے کہ بعد میں اپنے ماضی پہ شرمندگی ہو۔ اس طرح زندہ رہو کہ مرتے وقت کہہ سکو "میری تمام زندگی اور قوت دنیا میں صرف ایک ہی مقصد کے لئے وقف رہی اور وہ ہے بنی نوعِ انسان کی آزادی" ۔ لینن ۔

یہ اقتباس مسٹر بھٹو نے اپنی دو تحریروں میں نقل کیا ہے۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء کے تحریری اخباری بیان اور اپنی نئی کتاب "اگر مجھے قتل کر دیا گیا" میں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء کا اخباری بیان انہوں نے اپنی کتاب "عظیم المیہ" کی رونمائی کی تقریب میں جاری کیا تھا۔ اُس وقت پاکستان سنگین بحران میں مبتلا تھا، مشرقی بازو میں فوجی کارروائی ہو رہی تھی۔ اور مغربی پاکستان کے عوام بھی "اب کیا ہو گا، کیا ہونے والا ہے" جیسے سوالات کے سوالیہ نشان بنے تھے۔ گھٹن تھی۔ فوجی حکومت اقتدار کی منتقلی پر رضامند نہ تھی۔ بہانے بنا رہی تھی۔ اور اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوشش کر رہی تھی ایسی سیاسی فضا میں مسٹر بھٹو نے اپنے اخباری بیان کا اختتام مذکورہ بالا اقتباس سے کیا۔ اور "اگر مجھے قتل کر دیا گیا" نامی کتاب بھی ایسی ہی صورتِ حال بلکہ ۱۹۷۱ء سے بھی بدترین صورتِ حال میں لکھی گئی۔ ایسی صورتحال جس میں بقول مسٹر بھٹو "صرف میری زندگی ہی نہیں بلکہ اور بھی سب کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے" اور "بحرانوں کی پیداوار سیاست دان" نے ایسا بحران اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

موت کی کوٹھری میں لکھی جانے والی کتاب میں اس اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسٹر بھٹو اپنے ماضی پر شرمسار نہیں بلکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ "میری تمام زندگی اور قوت دنیا میں صرف ایک مقصد کے لئے وقف رہی اور وہ ہے بنی نوع انسان کی آزادی" اس سے مسٹر بھٹو کی خواہش "تاریخ مجھے محفوظ کرے" اور اچھے نام سے یاد کرے" کا اظہار بھی ملتا ہے۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے دورِ اقتدار میں دو مرتبہ کیا تھا، فرانس کے اخبار "لی مانڈے" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا "میں تاریخ کے ہاتھوں مرنے کی بجائے فوج کے ہاتھوں مرنا پسند کروں گا"۔ اور مارچ ۱۹۷۷ء میں چیف منسٹر ہاؤس کراچی میں اخبارات اور جرائد کے مدیروں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میں تاریخ میں اپنا نام بدعنوان کی حیثیت سے لکھوانے کی بجائے پسند کروں گا کہ میری لاش سڑکوں پر گھسیٹی جائے"۔

یہی وہ خواہش ہے جس نے لاڑکانہ کے جاگیردار گھرانے اور سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے بھٹو کو بقول شخصے تضادات کا مجموعہ بنا دیا۔ اگر انہوں نے نپولین بونا پارٹ کی سوانح عمری سے "طاقت کی سیاست" سیکھی، تو کمیونسٹ مینی فیسٹو سے "غربت کی سیاست" کا درس حاصل کیا اور سیاست کے ان دونوں طریقوں پر عمل کیا، وہ کرتے شلوار میں ملبوس بڑے بڑے عوامی اجتماعات سے خطاب کرتے، لیکن جب طبقہ اشرافیہ سے ملتے، تو ان کے بدن پر بہترین سوٹ ہوتا، سونے کے کف لنک ہوتے اور سونے کی ٹائی پن میں ہیرا لگا ہوتا، وہ ایک غریب اور عام آدمی سے عوامی زبان میں اور نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرتے، وڈیروں، پیروں اور بیوروکریٹس سے گفتگو کرتے تو آکسفورڈ کے لہجے میں انگریزی بولتے اور تیور چڑھے ہوتے۔ وہ نہایت جرأت سے جلسہ عام میں شراب پینے کا اعتراف کرتے، اُس کا جواز پیش کرتے، لیکن کچھ ہی عرصے بعد "اسلامی کانفرنس" میں شراب پر پابندی کا اعلان کر دیتے۔ کبھی وہ کہتے "میں کوئی الٹی میٹم یا دھمکی نہیں دے رہا ہوں، معمولی سا آدمی ہوں دھمکیاں کیا دے سکتا ہوں۔ صرف سیاست کی حقیقتیں بیان کر رہا ہوں" اور کبھی کہتے "مجھے کچھ ہو گیا تو ہمالیہ روئے گا"۔ ڈپلومیسی میں مدِ مقابل کی نفسیات سے فائدہ اٹھاتے، حساس اور صحیح مقامات پر انگلیاں رکھتے، سوویت یونین کے رہنماؤں سے مذاکرات میں لینن کے نظریہ پُرامن بقائے باہمی پر زور دیتے، مارکس، اینگلز اور لینن کی تحریروں سے حوالے دیتے، لیکن بھارتی لیڈروں سے گاندھی ازم آہنسا اور عدم تشدد کے فلسفے کے حوالے سے بات کرتے،

مسٹر بھٹو اپنے اس رویّہ کو تضاد کا نام نہیں دیتے بلکہ اس کے جواز میں کہتے ہیں۔ "میری شخصیت میں ایک شاعر بھی ہے اور ایک انقلابی بھی"۔

"شاعر" اور "انقلابی" بھٹو کو محبتیں بھی ملیں اور نفرتیں بھی، عوام سے اتنی محبت ملی کہ سات افراد نے اُس کے لئے خودسوزی کر لی، اور حکمران طبقات سے اتنی نفرت ملی کہ وہ اُس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ عوام، اٹھارہ ماہ کے مسلسل بھٹو دشمن پروپیگنڈے اور وائٹ پیپروں کی اشاعت کے باوجود بھٹو کے متوالے ہیں۔ اُس پر جان نثار کرتے ہیں۔ ڈرائنگ روموں کے سیاستدانوں کو بھٹو کی مقبولیت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جب کہ کاشتکار اور ہاری بھٹو پہ جان نچھاور کرنے کی وجہ یہ بتاتا ہے۔ "میں اس وقت آپ کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا ہوں۔ بھٹو سے پہلے آپ کی موجودگی میں چارپائی پر نہیں بیٹھ سکتا تھا، زمین پر بیٹھنا پڑتا تھا"۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غریب اور عام آدمی کو زمین سے اٹھا کر چارپائی پر بٹھانے والا بھٹو، سیاست کو چند شہروں سے نکال کر دیہات میں لے جانے والا بھٹو، عوام کا مقبول ترین رہنما، نئے پاکستان کا بانی ایوانِ وزیرِاعظم سے موت کی کوٹھری میں کیسے پہنچ گیا۔ یہ جاننے کے لئے تاریخ کے اوراق پلٹنے ہوں گے۔ کیونکہ تاریخ نہ صرف

واقعاتِ گذشتہ کی امین ہوتی ہے بلکہ مستقبل کی رہبر بھی۔

مسٹر بھٹو پاکستان کے پہلے حکمران تھے، جو عوامی ریلے اور عوام کی طاقت سے برسرِ اقتدار آئے۔ انہوں نے عوام سے کچھ وعدے بھی کئے تھے۔ علاوہ ازیں "شاعر اور "انقلابی" بھٹو کے اپنے نظریات اور تصورات بھی تھے، جنہیں وہ عملی حقیقت دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے متعدد اصلاحات کیں، استحصالی طبقات پر ضربیں لگائیں لیکن وہ ان اصلاحات کو مستحکم نہ کر سکے۔ سبب یہ تھا کہ ان کی پیپلز پارٹی میں تربیت یافتہ کاڈر نہیں تھا بلکہ یہ کہا جائے کہ پیپلز پارٹی اپنے قیام سے لے کر اب تک صحیح معنوں میں منظم سیاسی جماعت نہ بن سکی، تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنی پارٹی کے اس کمزور پہلو کے پیشِ نظر مسٹر بھٹو نے نیپ، جس پر یحییٰ فوجی حکومت نے پابندی لگا دی تھی، کو نہ صرف بحال کیا بلکہ اُس سے تعاون کے طلب گار بھی ہوئے۔ قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی بھاری اکثریت ہونے کے باوجود انہوں نے مرکزی حکومت میں نیپ کو دو وزارتوں کی پیشکش کی۔ نیپ کی جانب دستِ تعاون دراز کرنے کی وجہ یہ تھی کہ پیپلز پارٹی اور نیپ دونوں ہی سوشلزم کی حامی تھیں۔ اور مسٹر بھٹو نیپ سے اتحاد کر کے اپنے سوشلسٹ منشور کو عملی طور پر نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن نیپ نے پیپلز پارٹی سے تعاون کرنے کی بجائے بقول بزنجو ملاؤں (جمعیت علمائے اسلام) سے اتحاد کر لیا۔ نیپ کی قیادت بھٹو دشمنی میں اتنی اندھی ہو گئی کہ اس نے اپنے منشور کو بالائے طاق رکھ دیا۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے سندھی کو صوبائی زبان کا درجہ دیا۔ تو نیپ کی قیادت نے اردو بولنے والوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے اپنے منشور کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے بلوچستان اور سرحد میں اردو کو صوبائی زبان کا درجہ دیدیا۔ حالانکہ نیپ کے منشور کے مطابق سرحد میں پشتو اور بلوچستان میں بلوچی کو صوبائی زبانیں بنانا چاہیئے تھا۔ ولی خان نے بڑے فخر سے کہا: "جناب! ہم پر تو صوبائی زبانوں کے علمبردار ہونے کا یوں ہی الزام لگایا جاتا ہے۔ دیکھئے ہم نے تو اردو کو صوبائی زبان قرار دے دیا ہے۔" پھر سیکولرازم اور سوشلزم کی حامی نیپ، جماعت اسلامی سے بھی زیادہ مذہبی، جنونی اور رجعت پسند بن گئی اور مذہبی سیاسی جماعتوں سے مل کر بھٹو حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئی۔ ان حالات میں مسٹر بھٹو نے مسلم لیگ قیوم گروپ سے اتحاد کیا اور بیوروکریسی جو دسمبر ۱۹۷۱ء میں شکست کھا چکی تھی، جان پکڑنے لگی۔ اور مسٹر بھٹو کے گرد جال کسنا شروع کر دیا۔ پھر بقول سردار مینگل بھٹو صاحب بیوروکریسی کے "ٹریپ" میں آ گئے اور اس امر کا علم انہیں اس وقت ہوا جب کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اگر نیپ اور پیپلز پارٹی کا اتحاد ہو جاتا تو نہ صرف مسٹر بھٹو نافذ کردہ اصلاحات مستحکم کر لیتے بلکہ بیوروکریسی کو بھی پر پُرزے نکالنے کا موقع نہ ملتا اور ملک میں مارشل لاء نہ لگتا۔

پیپلز پارٹی کی حکومت کی صنعتوں کو قومیانے کی پالیسی زرعی اصلاحات، زرعی انتظام کی اصلاحات، سرداری نظام کے خاتمے، لیبر اصلاحات وغیرہ اور خارجہ پالیسی کی وجہ سے اندرونِ ملک بہت سے طبقات اور بیرونِ ملک بہت سی طاقتیں مسٹر بھٹو کے خلاف ہو گئیں اور انہوں نے انہیں محرومِ اقتدار کرنے کے لئے سازشیں شروع کر دیں۔ اندرونِ ملک بھٹو حکومت کے خلاف جو عناصر صف آرا ہوئے وہ یہ تھے۔ بڑے سرمایہ دار، بڑے

شاہ فیصل اور

کرنل قذافی سے

دوستانہ تعلقات

شہنشاہ ایران

کی ناراضگی

کا باعث بنے

زمیندار، زرعی صنعت کار اور آڑھتی، بڑے کاروباری، بیوروکریسی (سول اور ملٹری دونوں) ملّا، رجعت پسند سیاستدان، دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کی ذیلی طلباء تنظیمیں اور الجھے ہوئے خیالات کے دانشور۔

بڑے سرمایہ دار اور صنعت کار (گماشتہ سرمایہ دار) مسٹر بھٹو سے اس لئے ناراض تھے کہ انہوں نے بھاری صنعتوں، بنکنگ اور انشورنس انڈسٹری اور شپنگ انڈسٹری کو قومی تحویل میں لے لیا تھا، پیپلز پارٹی نے برسرِ اقتدار آتے ہی گماشتہ سرمایہ دار کے سرخیل جنرل حبیب اللہ، داؤد اور ولیکا کو گرفتار کیا۔ ۲۲ خاندانوں کے ارکان پر بیرونِ ملک جانے پر پابندی لگا دی۔ گو کچھ عرصے کے بعد ان سرمایہ داروں کو رہا کر دیا گیا۔ بیرونِ ملک جانے کی اجازت بھی دے دی گئی لیکن سرمایہ دار اونٹ کی طرح کینہ پرور ہوتے ہیں۔ انہوں نے موقع دیکھتے ہی وار کیا۔ بڑے زمیندار زرعی اصلاحات کی بناء پر مسٹر بھٹو کے مخالف ہو گئے۔

زرعی صنعتوں، کاٹن فیکٹریوں، چاول صاف کرنے کے کارخانوں اور فلور ملز کو سرکاری تحویل میں لینے سے زرعی صنعت کار ناراض ہو گئے۔ پیپلز پارٹی نے کسانوں کو ان کی اجناس کی زیادہ قیمت دلانے کے لئے آڑھت کا نظام ختم کر دیا۔ کارخانے براہ راست کسانوں سے کپاس، چاول اور گندم خریدنے لگے اور آڑھتیوں کے پاس صرف دالوں، مرچوں اور دیگر چھوٹی موٹی اجناس کا کاروبار رہ گیا۔ نتیجتاً یہ بھی پیپلز پارٹی کی حکومت کے دشمن ہو گئے۔ اسی طبقے نے کھل کر پی این اے کی مالی امداد کی۔ پی این اے کی تحریک کے دوران کاٹن فیکٹری کے ایک سابق مالک نے مجھے بتایا کہ اس نے پی این اے کو چار لاکھ روپیہ دیا ہے اور اگر پی این اے کو مزید ضرورت ہوئی تو وہ مزید روپیہ دے گا۔ مالی امداد کی وجہ یہ بتائی کہ پی این اے نے زرعی صنعتوں کو سابق مالکان کو واپس کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ "۸ سال قبل ہم چار بھائیوں نے سیالکوٹ میں ایک جننگ فیکٹری لگائی تھی جس پر چھ لاکھ کی لاگت آئی تھی۔ بھٹو حکومت نے ہماری فیکٹری اپنی تحویل میں لے کر "بک ویلیو" کے مطابق ہمیں ڈیڑھ لاکھ روپے تھما دیئے جبکہ فیکٹری کی مارکیٹ ویلیو بیس لاکھ سے بھی زائد تھی۔ فیکٹری کی واپسی کے لئے اگر ہمیں دس لاکھ بھی خرچ کرنے پڑے تب بھی فائدے میں رہیں گے"۔

بیوروکریسی (سول اور ملٹری دونوں) بھی مسٹر بھٹو کی حکومت سے ناخوش تھی کیونکہ مسٹر بھٹو نے برسرِ اقتدار آتے ہی متعدد جنرلوں کو ریٹائر کیا اور ہزاروں سول بیوروکریٹس کو جبری ریٹائرمنٹ دے دی۔ علاوہ ازیں ماضی کی حکومتوں نے سول بیوروکریٹس کو ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی "خدمات" کے صلے میں زرعی اراضی دینے کی روایت ڈالی تھی۔ فوجی جنرلوں اور دیگر اعلیٰ حکام کو بھی زمینیں دی جاتی تھیں۔ پاکستان کی زرخیز ترین اراضی خصوصاً غلام محمد بیراج میں فوجیوں کو اراضی دی گئی تھی۔ بھٹو حکومت نے سول بیوروکریٹس کو زرعی اراضی دینے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ بعض سے واپس بھی لے لی گئیں۔ ایوب خان نے جو زرعی اصلاحات کی تھیں وہ فوجی غیر حاضر زمینداروں پر لاگو نہیں کی گئیں تھیں۔ بھٹو زرعی اصلاحات میں بھی فوجیوں کی اراضی متاثر نہیں ہوئی لیکن ہفت روزہ "فار ایسٹرن اکانک ریویو" کے مطابق مسٹر بھٹو نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے آئندہ پانچ سالہ دورِ حکومت میں جو زرعی اصلاحات کریں گے ان کا اطلاق فوجیوں کی اراضی پر بھی کیا جائے گا اور "غیر حاضر زمینداری" نظام کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دیگر ممالک کی طرح پاکستانی جنرلوں اور دیگر اعلیٰ فوجی حکام کے مفادات صرف "ڈیفنس اور آرمڈ سروسز" تک

ان کی عرب دوستی موت کا پروانہ لے آئی

محدود نہیں بلکہ ان کے مفادات دیگر شعبوں میں بھی پھیلے ہوتے ہیں یہ "غیر حاضر زمین دار" ہیں، صنعت کار ہیں، مسلح افواج سے ریٹائرمنٹ کے بعد اعلےٰ سول عہدوں پر فائز کر دیئے جاتے ہیں۔ نیم سرکاری خود مختار اداروں، کارپوریشنوں اور نجی اداروں میں منیجنگ ڈائرکٹر وغیرہ بن جاتے ہیں۔ ہزاروں روپے کی پنشن فوج سے لیتے ہیں اور ہزاروں روپے کی تنخواہ سرکاری خود مختار اور نجی اداروں سے حاصل کرتے ہیں۔

جنرل، بھٹو حکومت کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ راؤ رشید نے اپنے حلف نامے میں کہا ہے کہ انہوں نے وزیر اعظم بھٹو کو جنرلوں کی سازش کی اطلاع دے دی تھی۔

ملا، رجعت پسند سیاست دان، دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کی طلباء تنظیمیں اور الجھے ہوئے خیالات کے دانشور کیونکہ استحصالی طبقات کے مفادات کے محافظ ہوتے ہیں اور مسٹر بھٹو ان کے آقائے ولی نعمت کے مفاد پر ضربیں لگا رہے تھے چنانچہ یہ عناصر بھی بھٹو کے دشمن ہو گئے۔

یہ تو تھیں اندرون ملک بھٹو دشمن طاقتیں، بیرون ملک امریکہ، برطانیہ اور ان کے اتحادی مسٹر بھٹو کی پالیسیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ کیونکہ مسٹر بھٹو کی پالیسیاں امریکہ کے عالمی اور علاقائی مقاصد سے متصادم تھیں، وہ امریکی مفادات میں مداخلت کر رہے تھے۔ اور امریکی دفتر خارجہ کے مطابق "مسٹر بھٹو اتنے بڑھتے جا رہے ہیں کہ اپنے جامے میں نہیں سماتے" امریکہ کے عالمی مقاصد یہ تھے۔

۱: ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنا اور مسلم دنیا کو ایٹمی صلاحیت سے محروم رکھنا۔

۲: موجودہ عالمی اقتصادی ڈھانچے کو برقرار رکھنا

۳: اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں میں تیسری دنیا کی آواز کو محدود کرنا اور تیسری دنیا کو متحد نہ ہونے دینا۔

امریکہ کے علاقائی مقاصد یہ تھے:

۱: مسلم اتحاد کو توڑنا اور مشرق وسطےٰ پر اپنا سمجھوتہ مسلط کرنا۔

۲: جنوبی ایشیا میں بھارت کی بالادستی قائم کرنا۔

مسٹر بھٹو کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ "عیسائی، یہودی اور ہندو دنیا" کے پاس ایٹمی ہتھیار اور توانائی اور صلاحیت موجود ہے اور صرف مسلم دنیا اس سے محروم ہے چنانچہ انہوں نے فرانس سے ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کی خریداری کا معاہدہ کیا۔ اس پلانٹ سے پاکستان ایٹمی طاقت بن جاتا جس کے نتیجہ میں جنوبی ایشیا میں بھارت کی بالادستی اور مشرق وسطےٰ پر سمجھوتہ مسلط کرنے کا امریکی منصوبہ ناکام ہو جاتا۔ چنانچہ ابتداء میں امریکہ نے مخالفت کی اور بالآخر کھلی دھمکیوں پر اتر آیا۔ لاہور میں امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کیسنگر نے مسٹر بھٹو کو دھمکی دی کہ اگر ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کی خریداری کا معاہدہ منسوخ نہیں کیا تو "یہ نہ بھولو کہ ہم تمہاری حکومت کو جب چاہیں ختم کر سکتے ہیں اور امریکہ تمہارا حشر ایسا کرے گا جو تیسری دنیا کے لئے ایک مثال ہو گا" لیکن مسٹر بھٹو اس دھمکی میں نہیں آئے۔

مسٹر بھٹو موجودہ عالمی اقتصادی نظام کے مخالف تھے، دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس میں نئے اقتصادی نظام کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو کے وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن نے اقوام متحدہ میں بھی یہ مسئلہ پوری شدومد سے اٹھایا تھا۔ ہالینڈ کے اخبار "دی ٹیلیگراف" کے ایڈیٹر انچارج جے جی ہیٹنگ کو ۱۹۷۶ء میں انٹرویو دیتے ہوئے مسٹر بھٹو نے کہا تھا "نیا اقتصادی نظام ۱۹۸۰ء سے پہلے قائم ہونا چاہیئے" یہ مطالبہ امریکہ کے عالمی مقاصد کے منافی تھا۔

سوکارنو اور ناصر بھٹو کے آئیڈیل تھے۔ یہ دونوں عظیم رہنما تیسری دنیا کے اتحاد کے زبردست علمبردار تھے، اس کے علاوہ مسٹر بھٹو کا خیال تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ تیسری دنیا کی کانفرنس بلائی جائے اور اقوام متحدہ میں ترقی یافتہ ممالک کی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا "بنڈونگ کانفرنس کو منعقد ہوئے ایک نسل کی زندگی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اگر بنڈونگ کانفرنس اہم اور ضروری تھی اور الجزائر کانفرنس منعقد نہیں ہو سکی تھی تو یقیناً یہ بات ضروری ہے کہ پچھلے ۲۵ برسوں میں جو بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے پیش نظر ایسی ایک اور کانفرنس بلکہ اس سے زیادہ بڑی کانفرنس بلائی جائے کیونکہ یہ کانفرنس زیادہ ضروری اور ناگزیر ہو گئی ہے" یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے دفتر خارجہ کے بیوروکریٹس اس تجویز کے مخالف تھے ان کا خیال تھا کہ "ابھی وقت نہیں آیا"۔ لیکن مسٹر بھٹو نے ان سے اختلاف کیا اور شمالی کوریا کے دورے کے دوران انہوں نے تیسری دنیا کی کانفرنس کی تجویز پیش کر دی۔

مسٹر بھٹو کی علاقائی پالیسیاں بھی امریکہ کے علاقائی مفادات سے متصادم تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد سے ہی امریکہ کی کوشش

رہی ہے کہ جنوبی ایشیا میں بھارت کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد تو امریکہ نے اپنی اس خواہش کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اس کے نزدیک پاکستان کی اہمیت ایران سے بھی کم ہو گئی تھی۔ وہائٹ ہاؤس بھارت اور ایران کے گھوڑے کو آگے بڑھانا چاہتا تھا لیکن مسٹر بھٹو بھارت سے پرامن بقائے باہمی کے اصولوں اور برابری کی بنیاد پر تعلقات تو چاہتے تھے لیکن بالادستی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں مسٹر بھٹو کی معزولی کے فوراً بعد کارٹر انتظامیہ کے نائب وزیر خارجہ نے بیان دیا کہ "اب بھارت کو جنوبی ایشیا کی قیادت سنبھال لینی چاہئیے" اور ہمارے دفتر خارجہ کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ رسمی احتجاج ہی کرتا۔

مسٹر بھٹو اپنی خارجہ حکمت عملی میں مشرق وسطےٰ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد "نئے پاکستان" کے علاقائی مفادات مشرق وسطےٰ سے وابستہ ہو گئے تھے لیکن اس سے بھی اہم وجہ یہ تھی کہ "نئے پاکستان" کی تباہ شدہ اقتصادیات کو بحال کرنے، تعمیر نو اور ترقی کے لئے سرمائے کی ضرورت تھی۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک اور عالمی ادارے اول تو ضرورت کے مطابق امداد نہیں دیتے تھے۔ دوم یہ کہ شرائط بہت کڑی ہوتی تھیں۔ سیاسی طور پر بلیک میل کرتے تھے چنانچہ پاکستان کو امداد کے نئے ذرائع کی ضرورت تھی اور مشرق وسطےٰ کے تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتے تھے۔ اس لئے مسٹر بھٹو نے مشرق وسطےٰ پر خصوصی توجہ دی۔ سرمایہ اور امداد حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ مشرق وسطےٰ کا سب سے بڑا مسئلہ فلسطین تھا اور اب بھی ہے، بھٹو حکومت نے غیر مشروط فلسطینی کاز کی حمایت کی۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ میں استطاعت بھر ہر طرح کی امداد کی اور اعلان کیا "یہ صرف عربوں کی نہیں ہماری بھی جنگ ہے" اسرائیلی فوجیں شام کی سرحدیں عبور کر کے دمشق روڈ پر آ گئیں تھیں اور دمشق ۲۲ میل رہ گیا تھا۔ اس پر مسٹر بھٹو نے حکم دیا کہ اردن (جو جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا) میں جو پاکستانی آرمی اور فضائیہ کے دستے موجود ہیں وہ شام منتقل کر دیتے جائیں۔ شاہ حسین نے اس منتقلی کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر مسٹر بھٹو نہ مانے۔ اور شاہ حسین نے جنگ کے دوران ہی بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے اپنی ناراضگی کا ثبوت دیا۔ اسلامی سربراہی کانفرنس میں بھی نہیں آئے اور اسی وجہ سے شاہ حسین نے ابھی تک مسٹر بھٹو کی سزائے موت منسوخ کرنے کی اپیل نہیں کی ہے۔ پاکستانی فوج نے شام میں اسرائیلی فوج کی پیش قدمی کو روکا اور اُسے پیچھے دھکیلا۔ اس زمانے میں اسرائیلی وزیر دفاع اور تل ابیب ریڈیو نے کہا تھا کہ شام کی طرف سے پاکستانی فضائیہ لڑ رہی ہے۔ اس جنگ کے فوراً بعد مسٹر بھٹو نے عربوں کے سرمایہ سے پاکستان میں مشترکہ آرڈیننس فیکٹریاں لگانے کی تجویز پیش کی۔ لیکن یہ منصوبہ عملی روپ اختیار نہ کر سکا۔ لیکن لیبیا کے سرمائے سے پاکستان میں ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ لگانے کا منصوبہ طے ہو گیا۔ کیونکہ لیبیا کو احساس تھا کہ اسرائیل کے پاس ایٹم بم ہے اور اسے اس وقت تک شکست نہیں دی جا سکتی جب تک عربوں کے پاس ایٹم بم نہ ہو۔ اسی کے ساتھ مسٹر بھٹو نے شاہ فیصل کو تجویز پیش کی کہ سعودی عرب اور پاکستان مشترکہ طور پر ایک جدید ترین بحری بیڑہ بنائیں۔ جو خلیج کی عرب ریاستوں کی حفاظت کرے۔ شاہ فیصل اس پر آمادہ ہو گئے اور طے پایا کہ سعودی عرب سرمایہ فراہم کرے گا اور پاکستان افرادی قوت اور فنی صلاحیت، لیکن شاہ فیصل کی شہادت کی وجہ سے اس منصوبے پر عمل نہیں ہو سکا۔

مسٹر بھٹو کی اس تجویز سے شہنشاہ ایران ناراض ہو گئے کیونکہ وہ خود خلیج کے "پولیس مین" بننا چاہتے تھے اسی وجہ سے وہ اسلامی سربراہی کانفرنس میں نہیں آئے اور جب لاہور میں کانفرنس ہو رہی تھی عین انہیں دنوں انہوں نے تیل پر پابندی سے قبل کی قیمت پر بھارت کو تیل سپلائی کرنے کا معاہدہ کیا۔ اور جب "نیویارک ٹائمز" کے نمائندے نے

دفتر خارجہ نے اسلامی سربراہ اور تیسری دنیا کی کانفرنسوں کی مخالفت کی تھی !

انہی دنوں شہنشاہ سے انٹرویو کے دوران سوال کیا کہ کیا وہ پاکستان سے بھی اس قسم کا معاہدہ کریں گے تو انہوں نے جواب دیا "پاکستان" طالع آزما قذافی سے تیل حاصل کر سکتا ہے"۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد مسٹر بھٹو نے پاکستان کے دفتر خارجہ سے اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں تجاویز دینے کو کہا۔ باوثوق ذرائع بتلاتے ہیں کہ دفتر خارجہ نے کانفرنس بلوانے کی مخالفت میں دلائل دیئے تھے لیکن مسٹر بھٹو نے بیوروکریسی کے اختلافی تجاویز کے باوجود کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس میں پاکستان نے نہ صرف تنظیم آزادی فلسطین کو فلسطینی عوام کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا بلکہ فلسطینی کاز کو اتنی شدومد سے اٹھایا کہ اقوام متحدہ کو جناب یاسر عرفات کو بلوانا پڑا کہ وہ آئیں اور اپنے موقف کا اظہار کریں۔ اقوام متحدہ میں یاسر عرفات سے سربراہ ریاست جیسا پروٹوکول اختیار کیا گیا۔ جو اس سے قبل اس عالمی ادارے نے کسی بھی تنظیم کے سربراہ کے ساتھ اختیار نہیں کیا تھا۔

دوسری جانب امریکہ اپنی مرضی کا معاہدہ عربوں پر مسلط کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ بھٹو حکومت کو معزول کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء کو مسٹر بھٹو نے قومی اسمبلی میں کہا تھا "میں سادات نہیں ہوں"۔ مارشل لا انتظامیہ نے صدر سادات کے دورہ اسرائیل اور مجوزہ معاہدے کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا، اُس سے امریکہ کے منصوبے کو حمایت ملی۔

دوسری جانب برطانیہ بھی مسٹر بھٹو کا دشمن ہو گیا۔ اس کی وجوہ یہ تھیں کہ بھٹو حکومت کے دور میں پاکستان دولت مشترکہ سے نکلا۔ پھر پاکستان میں برطانوی انشورنس کمپنیوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ برطانیہ نے معاوضہ مانگا لیکن مسٹر بھٹو نے انکار کر دیا جب کہ موجودہ مارشل لا انتظامیہ نے معاوضہ ادا کر دیا لیکن سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ مسٹر بھٹو کے وزیر خارجہ عزیز احمد اور افغان وزیر خارجہ کے درمیان ۱۹۷۶ء میں لاہور میں ایک معاہدے کے مسودے پر سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ افغانستان ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد کے طور پر تسلیم کرے گا۔ اور اس کے بدلے میں پاکستان کالعدم نیپ کے رہنماؤں کو رہا کر دے گا۔ اس معاہدے پر مسٹر بھٹو کے مجوزہ دورۂ کابل اپریل ۱۹۷۷ء میں دستخط ہونے تھے۔

ڈیورنڈ لائن کا معاہدہ طے کرانے کی ذمہ داری ڈیورنڈ کو سونپتے وقت وائسرائے نے اس سے کہا تھا "دیکھو ڈیورنڈ! تم اس مسئلے کو خوب سمجھتے ہو اسی لئے یہ مشن تمہیں دیا گیا ہے۔ ہم ہمیشہ ہندوستان میں نہیں رہیں گے لیکن ہمیں یہ ضمانت حاصل کرنی چاہئیے کہ ہمارے مفادات مستقل رہیں اور یہ اسی صورت میں محفوظ رہ سکتے ہیں کہ جب

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

بھٹو آیت اللہ سے دس گنا زیادہ طاقتور ثابت ہونگے

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین، سابق وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کی کتاب "اگر مجھے قتل کر دیا گیا" — بین الاقوامی سطح پر موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ اس کتاب پر اسٹیٹسمین انڈیا کے چیف ایڈیٹر جناب پران چوپڑا نے درج ذیل تبصرہ کیا ہے جسے من و عن شائع کیا جا رہا ہے یہ تبصرہ جناب بھٹو کی سپریم کورٹ آف پاکستان میں نظرثانی کی درخواست کے فیصلے سے قبل لکھا گیا تھا۔

(ادارہ)

***

پانچ شگوفے

انٹیلی جنس بیورو آف پاکستان کے ایک سابق ڈائریکٹر راؤ عبدالرشید نے سپریم کورٹ آف پاکستان کو مطلع کیا ہے کہ پاکستان پر حکومت کرنے والے فوجی گروہ کے ایک معتبر رکن بریگیڈیئر عبدالنعیم نے ذوالفقار علی بھٹو، جو ملک کے صدر اور معزول ہونے تک وزیر اعظم تھے، جنہیں جیل میں ڈالا گیا اور سزائے موت دی گئی، کے بارے میں ایک دن حسب ذیل گفتگو کی۔

مسٹر بھٹو صدرِ مملکت کی حیثیت سے ۱۹۷۳ء کے آئین کی توثیق کر رہے ہیں

بریگیڈیئر عبدالنعیم "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آرمی مسٹر بھٹو کو دوبارہ اقتدار میں دیکھنا برداشت کر سکتی ہے؟"

راؤ عبدالرشید، جو بھٹو کے ایک معتمد اسپیشل سیکریٹری تھے، نے معنی خیز خاموشی اختیار کی۔

بریگیڈیئر نعیم خود اپنے سوال کا جواب دیتے ہیں اور کہتے ہیں "ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی"

رخصت ہونے سے پہلے بریگیڈیئر نعیم راؤ عبدالرشید کو مشورہ دیتے ہیں" براہِ مہربانی آرمی سے تعاون کیجئے"۔

یہ گفتگو اس شدید خطرے کا جامع اظہار ہے جو مسٹر بھٹو کے سر پر منڈلا رہا ہے" اس تنگ، تاریک اور بدبودار موت کی کوٹھری میں، جس میں دن کے ۲۲ یا ۲۳ گھنٹے بند رہتا ہوں" یہ ہے وہ انداز جس میں مسٹر بھٹو اس جگہ کا خاکہ کھینچتے ہیں جو ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں پچھلے تقریباً ایک سال سے انکی رہائش گاہ ہے۔

بھٹو نے اس سزائے موت کے خلاف سپریم کورٹ سے اپیل کی ہے جو انہیں لاہور ہائی کورٹ نے اس مبیّنہ الزام پر دی ہے کہ جب وہ برسرِ اقتدار تھے تو ان کی ہدایت پر ایک سیاسی قتل ہوا تھا۔ سپریم کورٹ نے سماعت مکمل کر لی ہے اور فیصلہ محفوظ کر لیا ہے لیکن پاکستان کی فوجی حکومت نے، بھٹو الزام لگاتے ہیں، سپریم کورٹ پر، جبکہ وہ ان کی اپیل کی سماعت کر رہی ہے، اثر انداز ہونے کے لئے ان کے خلاف پروپیگنڈے کا طومار باندھ رکھا ہے۔ باقاعدہ وقفوں کے ساتھ قرطاس ابیض شائع کئے جا رہے ہیں جن میں صدر اور وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کی کارکردگی کی مذمت کی جا رہی ہے

لاہور سماعت کی کوالٹی کے بارے میں کئی شبہات ظاہر کئے گئے ہیں جن میں امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل رمزے کلارک بھی شامل ہیں لیکن یہاں زیادہ اہم یہ سوال ہے کہ اگر سپریم کورٹ سزائے موت کی توثیق کر دے تو کیا بھٹو کو پھانسی دینے کے لئے رائے عام ہموار کی جا رہی ہے؟ جواب کا اندازہ تو کوئی بھی شخص لگا سکتا ہے لیکن سزا یافتہ قیدی کے نکتۂ نظر سے پانچ پرُ شگون علامات ہیں۔

قومی اتحاد کو انتخابات جیتنے کے لئے ۳۰ کروڑ روپے مہیا کئے گئے

پہلی کا تعلق ایران سے ہے اور اس کی تصدیق بریگیڈیئر نعیم نے کی ہے۔ آیت اللہ خمینی، جو ۱۵ سال سے اپنے ملک سے جلاوطن رہے ہیں، اپنے ملک سے چند ہزار میل کے فاصلے پر پیرس کے مضافات میں قیام پذیر ہیں مپر دلوں میں جذبات کی شمع نئے سرے سے روشن کرنے کے لئے صرف اپنی سحر انگیزی کی شعاعیں استعمال کر رہے ہیں اگر وہ شاہ ایران جیسے طاقتور اور قدم گاڑے ہوئے بادشاہ پر زوال لا سکتے ہیں تو اگر بھٹو کو موقع مل گیا تو وہ صدر ضیاءؔ کی فوجی حکومت کے ساتھ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔

اس توضیح میں وزن اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ تہران کے اخبار" کیہان" کے مطابق ایک مرحلے پر صدر ضیاء نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ بھٹو کو جلاوطن ہو جانے کی اجازت دے دیں بشرطیکہ دوسرے ایران مملکت یہ ضمانت دیں کہ وہ آئندہ ۱۰ برس تک دوبارہ سیاست میں داخل نہیں ہوں گے لیکن ایران کے واقعات کو دیکھنے کے بعد وہ اس خیال سے منحرف ہو گئے۔

جناح کے بعد بھٹو پاکستان کے کسی بھی سیاستدان سے زیادہ کشش رکھتے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جس نے انہیں مختصر مگر درخشاں کیریئر دیا ہے۔ صرف ۲۰ سال قبل وہ لاڑکانہ کے ایسے کھلنڈرے تھے جن کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے تھے گو کہ وہ ایک مشہور خاندان کے سپوت تھے، زندہ دل شخصیت، روشن دماغ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک محدود جاگیردارانہ آسمان کا ستارہ بننا ان کا مقدر ہے۔ تب صدر مرزا کی نگاہ ان پر، بلکہ زیادہ درست بات یہ ہے کہ ان کے خاندان کے روابط پر، پڑی اور ۳۰ برس کی عمر میں وہ وزیر بن گئے۔ ان کی دانشورانہ استعداد آکسفورڈ کی قانون کی ڈگری اور یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں گزارے ہوئے سال۔ ان سب نے مل کر انہیں للچانے والا وزیر خارجہ کا عہدہ دلوایا جہاں سے انہیں بعد میں چین سے قریبی تعلقات کی پالیسی کی بنیاد رکھی تھی۔

لیکن ۱۰ سال بعد اُن کی شخصیت کا مقناطیس اس بے چین طلباء طاقت سے مربوط ہو گیا جو اس وقت اپنے کسی رہنما کی تلاش میں تھی اور بھٹو نے خاندانی تعلقات اور صدارتی سرپرستی کی بندشوں کو توڑ دیا۔ اولاً انہوں نے صدر ایوب کا تختہ الٹنے کے لئے ملک کے نوجوانوں کو متحرک کیا۔ اور اس کے بعد اپنی مقبولیتِ عام کی تعمیر کی اور اسے ممکنہ طور پر فوج کی بندوقوں کو چھوڑ پاکستان کی سب سے مضبوط طاقت بنا دیا۔

۱۹۶۸ء میں صدر ایوب پر تنقید کرنے پر ان کی مختصر عرصے کی قید نے ان کی چمک دمک میں اور اضافہ کر دیا۔ سنہ ۱۹۷۰ء اور سنہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ مغربی پاکستان کوئی اور ووٹ کی طاقت میں ان کی مشہور سحرکاری کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا جس طرح صدر ایوب نے انہیں ۱۹۶۸ء میں گرفتار کر کے ان کی کشش کو درخشاں بنا دیا تھا۔ اس طرح جنرل ضیاء نے ۱۹۷۷ء میں انہیں دوبارہ گرفتار کر کے واقعات کے اس سلسلے کو متحرک کیا جنہوں نے پاکستان کو شدید بحران اور بھٹو کو سولی کی سیڑھیوں تک پہنچایا ہے۔

بھٹو جنوبی ایشیا میں کہیں بھی پائے جانے والے تابناک ترین ذہنوں میں سے ہے

بھٹو وہ سربراہِ حکومت تھے، جنہوں نے چیئرمین ماؤ سے آخری ملاقات کی

جن وجوہات کی بناء پر جنرل ضیاء نے پہلی گرفتاری کی تھی اس کی ۲ توجیہات کی جاتی ہیں لیکن دوسری گرفتاری کی صرف ایک توجیہہ ہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد حزبِ اختلاف کی سب سے بڑی جماعت پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے خونریز مظاہرے ہوئے جس سے بھٹو کی حکمران پیپلز پارٹی کو شدید نقصانات ہوئے۔ شدید نقصان فتح میں ملنے والی برتری کی وجہ سے تھا حالانکہ اس سے کم اکثریت کے ساتھ پی پی پی کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

سعودی عرب نے اپنے پاکستان میں مقیم سفیر کے ذریعے شدید دباؤ ڈال کر دونوں فریقین کے درمیان مصالحتی گفتگو شروع کروائی اور کہا جاتا تھا کہ یہ کوشش تیزی سے ترقی کر رہی تھیں لیکن ۴ جولائی کو پی این اے کی جانب سے مذاکرات کرنے والوں میں سے ایک نے کہا کوئی پیش قدمی نہیں ہو رہی ہے اور اسی رات فوج نے کارروائی کی جس کے نتیجے میں بھٹو کی پہلی گرفتاری عمل میں آئی۔ ظاہر ہے کہ بغاوت کا منصوبہ اس پر عملدرآمد سے بہت پہلے بنایا گیا ہوگا۔ لیکن یہ منصوبہ کیوں بنایا گیا؟

ایک خیال یہ ہے کہ اپریل سے جون تک جس پیمانے پر فسادات ہوئے اس نے چیف آف دی آرمی اسٹاف کو قائل کر دیا کہ ملک کو بچانے کے لئے فوج کی مداخلت ضروری ہے اس لئے منصوبے تیار تھے۔ مذاکرات کی ناکامی کی اطلاع نے انہیں عملیتہ دکھانے کا کام دیا۔ دوسرا خیال بھٹو کا ہے جس کے مطابق "ایک غیر ملکی طاقت" انہیں اقتدار سے ہٹانے پر تلی ہوئی تھی اور جب وہ انتخابات میں پی این اے کے ذریعے انہیں شکست نہ دلا سکی تو وہ فوج کے ذریعہ حملہ آور ہوئی۔

ملک پر قبضہ کرنے کے چند ہی دنوں بعد جنرل ضیاء نے اعلان کیا کہ اکتوبر میں انتخابات کرائیں گے کیونکہ "آپریشن فیئرپلے" اس منصوبے کا خفیہ نام جس کے مطابق فوجی بغاوت عمل میں آئی کا مقصد جنرل ضیاء کے کہنے کے مطابق صرف یہ تھا کہ ایک کارروائی کی جائے یعنی منصفانہ انتخابات کے لئے مدد فراہم کی جائے لیکن بعد میں جو واقعات پیش آئے ان کے پیش نظر ان کی وضاحتیں درست نہیں ثابت ہوئیں۔

زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ جنرل ضیاء نے خود کو یہ یقین کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ گزشتہ تقریباً ایک سال میں بھٹو نے خود کو اتنا غیر مقبول بنا لیا تھا کہ وہ صرف دھاندلی کے ذریعے ہی انتخابات میں کامیابی حاصل کر سکتے تھے اور اب جبکہ فوج منصفانہ طرزِ عمل کی ضمانت دے رہی ہے تو پی پی پی کو شکست ہو جائے گی اور پاکستان کو بھٹو کی غلط حکمرانی سے نجات مل جائے گی لیکن جنرل ضیاء کو یہ دیکھ کر صدمہ پہنچا کہ غلط حکمرانی کے باوجود بھٹو کی مقبولیت کا فوری اثر کرنے والا جادو اب بھی برقرار تھا۔ بھٹو کے اردگرد ایسے مجمعے لگے جو اس سے پہلے کبھی نہیں لگے تھے۔ مقبولیتِ عام فوجی طاقت کے خلاف صف آرا تھی اور فوجی طاقت نے اس پر صرف وہی طریقہ اختیار کیا جو وہ کر سکتی تھی۔ سحر انگیزی اور دوسری سب باتوں کے ساتھ بھٹو کو دوبارہ جیل میں ڈال دیا گیا اور انتخابات کسی غیر محفوظ دن کے لئے ملتوی کر دیئے گئے۔

دوسری طرف جنرل ضیاء شاید ایسے انتہائی غیر مقبول سربراہِ حکومت اور سربراہِ مملکت ہیں کہ پاکستان کے حکمرانوں میں کبھی کوئی ایسا شخص نہیں گزرا اور ان میں کشش کی جو کمی ہے وہ انتظامی معاملات میں اپنے ریکارڈ یا کسی ایسی سیاسی جماعت کی پشت پناہی سے جس کی جڑیں عوام میں ہوں اس کمی کو پورا نہیں کرتے جیسا کہ ان کے بعض پیشروؤں نے کیا تھا۔ فوج اب بھی ان کی پشت پر ہے لیکن اس سے عوام کی محبت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ فوج ۱۹۷۱ء کے بعد سے اپنا امیج بحال نہیں کر سکی ہے جبکہ بھٹو نے کر لیا ہے۔

اس لئے اگر بھٹو کسی دن جیل سے نکل آئیں تو وہ جنرل ضیاء کے لئے اس سے دس گنا زیادہ طاقتور ثابت ہوں گے جتنے کہ آیت اللہ شاہ کے خلاف ثابت ہوئے ہیں حالانکہ شاہ اگر سحر انگیز نہیں تو کم از کم جاہ و جلال تو رکھتے تھے۔ اگر ان میں فراست نہیں تھی تو کم از کم ایک تصور تو رکھتے تھے اور اس تصور کے حصول کے لئے کارناموں کا ایک ریکارڈ رکھتے تھے۔

زندہ بھٹو ایک انتہائی خطرناک شخص ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دن آزاد ہوں اور اگلے دن اقتدار میں ہوں۔ اگر وہ دوبارہ برسرِ اقتدار آگئے تو پہلا کام جو وہ کرنا چاہیں گے وہ ان لوگوں سے حساب چکانا ہوگا جو آج انہیں عذاب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں اور جنرل ضیاء جس طرح بھی ہو انہیں اس موقع سے محروم کرنا چاہیں گے۔ اگر جنرل ضیاء کو یقین ہو جاتا ہے کہ، اور ان کے یہ یقین کرنے کی تمام تر وجوہات موجود ہیں، بھٹو کی گردن یا ان کی گردن۔ تو وہ جب بھی ہو سکے دوسرے کی گردن توڑ کر اپنی گردن بچانے کی کوشش کریں گے۔ اگر تاخیر ہو تو یہ بعد از وقت ہو جائے گا کیونکہ بھٹو کی نظر میں صدر ضیاء "شدید غداری" کا ارتکاب کر چکے ہیں جس کی سزا موت ہے۔

بھٹو کا نافذ کردہ ۱۹۷۳ء کا آئین طاقت کے ذریعے دستور کی خلاف ورزی کے جرم کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے اور جنرل ضیاء نے یقیناً بزورِ طاقت اس کی خلاف ورزی کی ہے انہوں نے آئین کو معطل کیا ہے اور ان طریقوں سے اس میں ترامیم کی ہیں جن کی آئین میں کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جس کو سابق صدر پاکستان چوہدری فضل الٰہی نے اس قدر ناگوار محسوس کیا کہ انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔

دوسرا نکتہ بھٹو کی معزولی کے بعد سے پاکستان کی سیاست کی نوعیت سے پیدا ہوتا ہے۔ فوجی حکومتیں اور مطلق العنان حکومتیں بالعموم، اپنی فطرت کے اعتبار سے رائے عامہ کے معاملے میں غیر حساس ہوتی ہیں۔ اسی لئے ان میں رائے عامہ کو نظر انداز کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے اور کسی لحاظ کے بغیر اپنے ایسے فیصلوں کو مسلط کرنے میں لگی رہتی ہیں جو ان کے

ٹھیکو کرٹیانہ معیار پر پورے اترتے ہوں چاہے ان کے محرکات اچھے ہوں یا برے۔ انتہائی جونیئر شراکت دار شہریوں کی حیثیت میں سیاست والوں کو نامزد کرنے کے باوجود جنرل ضیاء کی حکومت اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنرل ضیاء کی حکومت کو خود بھٹو سے سرزد ہونے والی کئی فاش غلطیوں کی وجہ سے، رائے عامہ یا زیادہ صحیح طور پر کہا جائے تو عام لوگوں کی رائے سے کٹ جانے کا خطرہ لاحق ہے۔ اپنے اقتدار کے آخری سالوں میں بھٹو نے پاکستان میں زندگی کے تمام شعبوں، فوج، انتظامیہ علمی پیشوں اور کاروبار سے ممتاز افراد کو نکال دیا تھا۔ اپنی خود پسندی سے اور بعض اقدامات میں اور خاص طور پر سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس کے معاملے میں غیر منصفانہ طور پر۔ یہی اس قسم کے لوگ ہیں جن کی طرف فوجی لیڈر رجوع کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ بھٹو کے خلاف اپنے تعصبات کو وسیع تر مشاورت کی آزمائش میں ڈالنا چاہیں۔ تعصب ناراضگی سے بات کرے گا اور اپنی فہم میں فوری طور پر توثیق پائے گا۔

ان حلقوں میں جن میں فوجی حکومت کے فیصلہ کرنے والے نقل و حرکت کرتے ہیں کئی لوگ بھٹو کے خون کے پیاسے ہو سکتے ہیں وہ حلقے جن میں بھٹو کی ستائش کی جاتی ہے ان کی سماعت سے دور ہیں۔ یہی وہ خاص طریقہ ہے جس کے تحت جنرل ضیاء نے وہ غلط رائے قائم کی اور ۱۹۷۷ء میں انتخابات کرانے کا حکم دیا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی اسی غلطی کے دہرانے کے خطرے میں ہوں لیکن جہاں بھٹو اپنی سابقہ غلطیوں کی قیمت اب ادا کریں گے وہاں ہو سکتا ہے ملک کو مستقبل قریب میں عوام کے غصے کی قیمت ادا کرنی پڑے۔

تیسرا شگون یہ ہے کہ اس مرحلے پر وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو وہ کر سکتے ہیں کہ یہ ان کی گردن نہ ہو اور یہ کہ بھٹو کسی "الباً" میں سڑتے نہیں رہیں گے جہاں سے وہ نپولینی انداز میں واپس آ سکیں بلکہ وہ انہیں موت واقع ہونے تک لٹکاتیں گے۔

چند پڑوسی اسلامی ممالک پاکستان کے پرامن مستقبل میں دوستانہ دلچسپی رکھتے ہیں اور صدر ضیاء میں ایک دوستانہ دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ وہ سوشلزم کے کافرانہ نظریئے جس کی بھٹو تبلیغ (عمل نہیں) کرتے تھے کے مقابلے پر قدیم اسلام کا نظریہ لا رہے ہیں، اس لئے انہوں نے صدر ضیاء کو مشورہ دیا ہے کہ سابق صدر کو پھانسی نہ دیں اور اس طرح پاکستان کو آگ نہ لگائیں اور خود اپنے مستقبل کو تباہی میں ڈالیں۔ اطلاعات کے مطابق انہوں نے پیش کش کی ہے کہ وہ بھٹو کو اپنے ملکوں میں جیل میں رکھیں گے بہالہ

سے وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

صدر ضیاء نے ان پیشکشوں کو مسترد کر دیا ہے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ اول تو وہ ملک جو بھٹو کو رکھے گا وہ صدر ضیاء کے سر پہ بندوق رکھے ہوگا وہ بھٹو کو رہا کر کے ٹریگر دبا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ممالک جن میں تخت محفوظ نہیں ہیں

اس معاملے میں صدر ضیاء غیر ممالک میں ردعمل کے بارے میں بھی اتنے ہی فکر مند ہیں جتنے کہ ملک کے اندر ردعمل کے بارے میں۔ جبکہ بھٹو کو نہ صرف ان کا جواب دینے کے موقع سے محروم رکھا جا رہا ہے (در حقیقت انہیں باہر کی دنیا سے کاٹ کر رکھا جا رہا ہے) بلکہ ان کے حامیوں کو بھی بڑی تعداد میں گرفتار کیا جا رہا ہے اور

میں سے جن کا ذکر ان کی اپیل میں
ان کے خلاف ٹھوس شہادت
بھٹو کا موقف یہ ہے
حد تک منطقی بنیاد ہے، یہ موقف
میں داخل کردہ ایک بیان میں ا

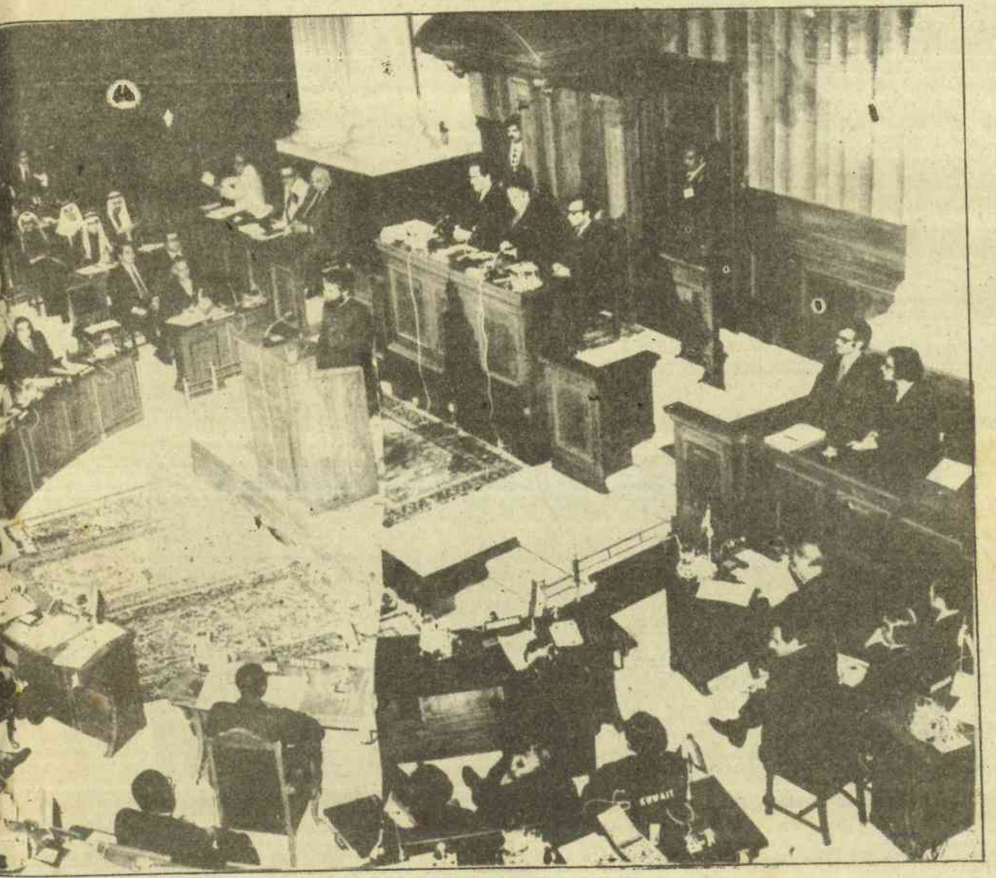

پاکستان کے حکمرانوں کو ایک نئے رُوز عوام کے غصے

ان کی جیلوں کے محفوظ ہونے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ان اطلاعات کی قطعی تصدیق نہیں ہو سکی لیکن سفارتی سطح پر ایسی بہت سی باتیں ہو چکی ہیں جو نشاندہی کرتی ہیں کہ ان کی توقیع بنیادیں موجود ہیں۔

بھٹو کے خلاف چوتھا گمبھیر شگون یہ ہے کہ صدر جس حد تک بھی رائے عامہ کو اہمیت دینے کا اظہار کر رہے ہیں وہ اس حد تک ہے کہ بھٹو کے خلاف پروپیگنڈے کا جو طومار ہے اس کے خلاف جس قدر ممکن ہو بھٹو کے دفاع کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے یکے بعد دیگرے جاری ہونے والے قرطاس ابیضوں کی وسیع سے وسیع تر تشہیر کی جا رہی ہے اور ملک کے باہر بھی اتنی ہی تشہیر کی جا رہی ہے جتنی کہ ملک کے اندر کیونکہ

انہیں عوام سے رابطہ رکھنے کے موقع سے محروم کیا جا رہا ہے

اس یکطرفہ بہاؤ کی بدترین مثال پہلا اور سب سے ضخیم قرطاس ابیض ہے اور یہ اس تعارف کا جو آپ اس وقت پڑھ رہے ہیں اور اس کتاب کا جو آپ پڑھنے ہی والے ہیں، بنیادی جواز ہے۔

جیسے ہی بھٹو نے اپنی سزائے موت کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی ویسے ہی حکومت پاکستان نے ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ضخیم قرطاس ابیض شائع کیا اور اسے وسیع اور طویل تشہیر دی۔ اس قرطاس ابیض میں ڈھیر ساری باتیں اکٹھا کر دی گئیں جن کے بارے میں حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ ان الزامات

کے مقدمے کی کارروائی کو متاثر
جاری کیا گیا اور اس انداز میں جاری
اختیار کرتے ہیں، اور کچھ شہادت
میں یحییٰ بختیار کو خاص طور پر نشانہ
کو ججوں کی نظروں میں تباہ کر دیا جائے
میں اٹارنی جنرل تھے، سپریم کورٹ
کے سینئر وکیل صفائی تھے۔ استغا
میں ایک گڑھا ایک ٹن شہادت
چونکہ جس وقت قرطاس ابیض
کی سماعت جاری تھی اور بھٹو اس د

ہے چند الزامات کے سلسلے میں
جس کا کسی حد تک جواز اور بڑی
انہوں نے اپنی اپیل کے سلسلے
یار کیا ہے کہ اعلانیہ طور پر ان

نے سماعت کے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور قرطاس ابیض کا تفصیلی جواب ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ایک بیان کے ذریعے دیا اور یہ بیان ان کی اپیل کی بنیادی دستاویزات میں سے ایک دستاویز بن گیا لیکن حکومت نے اسے عام نہیں ہونے دیا۔ اسے اخبارات میں شائع کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ بعض اخبارات جنہوں نے اسے شائع کرنے

...ضے کی قیمت ادا کرنا پڑے گی

...و متاثر کرنے کے لئے قرطاس ابیض
... جاری کیا گیا ہے۔ بھٹو یہ موقف
...شہادت کے ساتھ، کہ اس قرطاس ابیض
...نشانہ بنایا گیا ہے تاکہ ان کے اعتبار
...یا جائے۔ بختیار جو بھٹو کے دور اقتدار
...م کورٹ میں سماعت کے دوران ان
... استغاثے کے لئے بختیار کے اعتبار
...ہادت کے برابر تھا۔
...طاس ابیض جاری کیا گیا اس وقت اپیل
...ٹو اس وقت تک عدالت میں تھے انہوں

کی کوشش کی وہ سنسر شپ کی زد میں آگئے اور حکومت نے اس پر لیس پر سیل لگا دی جس میں یحییٰ بختیار نے اس کی چند کاپیاں چھپوانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس بیان کی ایک نقل، جس کے بارے میں بھٹو کہتے ہیں کہ "گھٹنے پر کاغذ رکھ کر لکھی گئی" موت کی کوٹھری سے اسمگل ہو کر باہر آئی۔ اسے یہاں بغیر کسی تبدیلی کے شائع کیا جا رہا ہے سوائے اس کے کہ بعض حصوں کو دوبارہ ترتیب دے کر باب بنائے گئے ہیں اور چند حصے حذف کئے گئے ہیں تاکہ نمایاں تکرار کو ختم کیا جا سکے۔

اپیل کی سماعت ختم ہونے کے بعد ۳ اور قرطاس ابیض جاری کئے گئے جبکہ جج اپیل پر غور کر رہے تھے وہ ان پانچوں قرطاس ابیضوں کی زد پر تھے۔ بھٹو کو موقع ملا کہ وہ ان میں سے ایک کے بارے میں جوابی دلائل دے سکیں جبکہ رائے عامہ کی نظر میں انہیں ان پانچوں میں سے کسی ایک کا بھی جواب دینے کا موقع نہیں ملا۔ پاکستان کے عوام جس وقت یہ فیصلہ کر رہے ہوں گے کہ ان کے سابق صدر اور وزیر اعظم، اور وہ تنہا صدر اور وزیر اعظم جو انہیں کبھی نصیب ہو سکا کے ساتھ جو کچھ بھی گزرے اس پر ان کا کیا رد عمل ہونا چاہئیے۔ انہیں اس کتاب کے پڑھنے والوں کے مقابلے میں بھٹو کی طرف سے پیش کئے جانے والے مقدمے کے بارے میں کم معلومات ہوں گی۔ عالمی پریس نے اس بیان کے صرف مختصر اقتباسات دیکھے ہیں جبکہ اس میں انکشافات کا ذخیرہ ہے۔

پانچویں اور آخری شگون پر اس وقت عمل ہو رہا ہے جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ باوثوق ذرائع کے مطابق توقع تھی کہ سپریم کورٹ آف پاکستان جنوری کے آخر میں اپنے فیصلے کا اعلان کرنے والا تھا۔ توقع یہ بھی تھی کہ اگر سپریم کورٹ سزائے موت کی تصدیق کر دے تو اس پر تیزی سے عمل کیا جائے گا اور بھٹو کو رحم کی اپیل کے لئے صرف کم از کم لازمی وقفہ دیا جائے گا بشرطیکہ وہ ایسا کرنا چاہیں (ان کی بیٹی نے تردید کی ہے کہ وہ ایسا کریں گے) سزا پر فوری عمل کرنا صرف فوجی انداز کے عین مطابق ہے بلکہ صورتحال کی ضروریات اس کی متقاضی ہیں اور اس کی اسلامی انصاف کی شدت پسندی سے بھی تقویت ملتی ہے جس کو پاکستانی صدر ضیاء کے تحت فروغ دے رہا ہے۔ جیسے جیسے آخری لمحات قریب آ رہے تھے بی بی سی نے پاکستان میں "ایک بے چین سکون" کی اطلاع دی جو پی پی پی کے لیڈروں کی مزید گرفتاریوں، مارشل لاء عدالتوں میں ان میں سے اکثر کے خلاف اقدامات، مختلف شہروں میں بعض دھماکوں، فوجی نقل و حرکت اور کسی وقت بھٹو کے ماتحت خدمات انجام دینے والے سرکاری افسروں کے استعفوں کی خبروں سے یہ سکوت ٹوٹتا تھا لیکن ان سطور کی تحریر تک فیصلے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا گو کہ سپریم کورٹ نے پہلے یہ کہا تھا کہ جنوری کے آخر تک فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ کیوں؟ موجودہ قیاس آرائیوں کی نہج کہ صدر ضیاء اس آگاہی کے پیش نظر کہ پھانسی دینے کے نتیجے میں گڑبڑ پھیلے گی، اس اسلامی وزراء کانفرنس کے اختتام تک انتظار کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو پاکستان میں فروری کے وسط میں ہونے والی ہے۔ یہ قیاس آرائی دور از کار ہے۔

لیکن سپریم کورٹ کی طرف سے فیصلے کے التواء اگر یہی وجہ ہے تو پھر یہ التواء مختصر عرصے کے لئے ہو گا جن فوری ضروریات کا دباؤ بھٹو پر ہے ان کے علاوہ صدر ضیاء کے اپنے فوری مستقبل کی ضرورت کا دباؤ بھی ہے۔ انہیں فروری کے آخر میں فوج سے ریٹائر ہونا ہے اور وہ اپنے مستقبل کی تشکیل اسی بات کی روشنی میں کر سکتے ہیں کہ وہ بھٹو کے مستقبل کی تشکیل کس طرح کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہیں گے کہ فیصلہ دوسروں پر چھوڑ دیں نہ ہی دوسرے یہ بات پسند کریں گے کہ ضیاء کو اجازت دے دیں کہ وہ بوجھ ان کی طرف منتقل کر دیں۔

اس قیاس آرائی کی تصدیق کرنے والے بھٹو کے اپنے اندیشے ہیں جن کا اظہار انہوں نے اپنے بیان میں کیا ہے اور جس پر حکومت نے پابندی لگا دی۔ اپنے خلاف حکومت کی تشہیری مہم کے ضمن میں بھٹو کہتے ہیں "مقصد یہ ہے کہ میرے خلاف رائے کی فضاء کو اور خراب کیا جائے تاکہ عدالت کے ادنیٰ ترین کلرک سے طاقتور ترین عدالت تک ہر ایک کو ایک ہی نتیجے تک پہنچایا جائے ..... اس حملے میں ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے ۲۸ اگست ۱۹۷۸ء تک بتدریج شدت آتی گئی ہے لیکن اب بھی تشہیر کا نکتہ عروج اس وقت آئے گا جب میری اپیل پر فیصلہ آنے والا ہو گا۔ بھٹو نے جس وقت یہ الفاظ تحریر کئے اس وقت تک صرف دو قرطاس ابیض جاری ہوئے تھے جن میں سے دوسرا ۲۸ اگست کو جاری ہوا تھا۔ اس کے بعد سے ۴ اور تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے جاری ہوئے۔ چوتھا بطور آخری قرطاس ابیض (کم از کم فی الحال) جاری کیا گیا ہے۔ نکتہ عروج آ گیا ہے۔ اب فیصلے میں زیادہ تاخیر نہ ہو گی۔

بھٹو کا زوال کیسے ہوا

بھٹو کے بیان کا ابتدائی حصہ زیادہ تر ان کے خلاف اس خاص الزام کے بارے میں ہے کہ انہوں نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی کرائی تھی اور اس مقصد کے لئے سندھ میں اپنے آبائی شہر لاڑکانہ میں ایک تفصیلی منصوبہ بنایا جسے استغاثہ "لاڑکانہ پلان" کا نام دیتا ہے۔

اس الزام کی تفصیلات اور بھٹو کا فوج کے خلاف جوابی الزام کہ اس نے انتخابات میں مداخلت کی اور بعض اوقات حزب اختلاف کی بڑی جماعت پی این اے کے لئے عملی طور پر کام کیا۔ پاکستان کے قاری کے لئے باہر کے کسی آدمی کی بہ نسبت زیادہ معقول ہو گا۔ انہیں سمجھنے کے لئے پاکستان کی داخلی سیاست کی پیچیدگیوں کے گہرے علم کی ضرورت ہے۔

لیکن اگر انہیں دور سے بھی دیکھا جائے یہ ان تمام لوگوں کے لئے سخت انتباہ ہے جو اس بات پر توجہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب بہت زیادہ طاقت حکومت کرنے والے چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتی ہے اور جب فوج یہ بھول جاتی ہے کہ ملکی سیاست کا بندوبست کرنا اس کا کام نہیں تو یہ جمہوری انتخابات

طریقۂ کار کا کیا حشر ہوتا ہے۔

لیکن اس دستاویز کی اصل قدر و قیمت ان مخصوص الزامات اور جوابی الزامات سے آگے اور بلند ہے۔ اور یہ قدر و قیمت زندہ رہے گی چاہے بھٹو زندہ رہے یا نہ رہے چاہے انہوں نے انتخابات میں دھاندلی کی ہو یا نہ کی ہو۔ یہ قدر و قیمت ان نگارشات میں ہے جو ایک تابندہ ذہن نے اسی موت کی کوٹھری میں تخلیق کی ہیں جو پاکستان میں قیام کے بعد سب سے تاباں ذہن ہے اور جنوبی ایشیا میں کبھی بھی پائے جانے والے تاباں ترین ذہنوں میں سے ہے۔

جیسا کہ ایسی نگارشات میں ہوتا ہے۔ بھٹو کے بیان میں افراط و تفریط اور تکرار ہے۔ بعض جگہوں پر یہ معاملے کے بارے بھی مبالغہ کرتا ہے۔ بعض مقامات پر ضرورت سے زیادہ سادہ ہوتا ہے اور بھٹو کی قوت فیصلہ بعض اوقات اپنے مسیحا ہونے کے کمپلیکس سے اور اس تعلی آمیز یقین سے دھندلا جاتی ہے کہ وہی اور صرف وہی ایسے شخص ہیں جو پاکستان کو نجات دلا سکتا ہے اور عوام کو ان کے آمروں سے چھٹکارا دلا سکتا ہے لیکن آخر میں اس سے جو چیز نکلتی ہے وہ ایک ممتاز سیاسی دستاویز ہے شاید ایک انتہائی فکر انگیز اور بے انتہا معلوماتی پاکستان کی تشخیص ہے۔ یہ گہرائی اور اہمیت کی حامل ایک دستاویز ہے کیونکہ یہ اس آدمی اور اس کے عہد کو منکشف کرتی ہے۔

یہ بھٹو کے لئے بہتر ہو یا نہ ہو یا ان کے خلاف عائد

بالادستی اور فوجی بغاوت ایک ہی سامراجی سکّے کے دو نام ہیں

خاص الزامات کے سلسلے میں ان کی صفائی کے لئے مؤثر ہو یا نہ ہو یہ پاکستان کی تاریخ کے طالب علم کے لئے اچھا ہے۔ اور اس سے زیادہ ترقی پذیر ممالک میں سیاسی عمل کے طالب علموں کے لئے ہے کہ پاکستان کے یہ سابق صدر اور وزیر اعظم اپنے بیان میں عدالت سے مخاطب نہیں ہیں۔ وہ اپنے تابندہ ذہن اور ترقی پذیر دنیا کے ایک انتہائی دلچسپ ملک میں اپنے منفرد تجربے کے پلیٹ فارم سے تاریخ سے مخاطب ہیں۔

بھٹو کو اپنے بیان کے فراق کا شکوہ ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ "مکمل صفائی کے بغیر یہ مضمون سیاسی بصیرت سے عاری اور اس کے مصنف کے معیار سے گرا ہوا ہوتا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد برصغیر میں ہونے والے واقعات پاکستان اور افغانستان کے درمیان تعلقات کی صورت حال نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کا مستقبل، وابستگی اور غیر وابستگی کے درمیان چکر لگاتے رہنا پاکستان کی تقدیر کے لئے دلدوز اہمیت کے حامل ہیں ایک متوازن تصویر پیش کرنے کا جو لازمی فریضہ عائد ہوتا ہے اس سے تجاوز قاری کے ساتھ زیادتی اور اس کی خوراک میں بھی کمی کرنے کے مترادف ہوتا۔"

پاکستان صرف دلچسپ ممالک میں سے ایک ہی نہیں بلکہ شاید سب سے زیادہ دلچسپ ملک ہے اگر آپ اس کا اس

نقطۂ نظر سے جائزہ لیں جو اس کتاب میں ایک اہم ترین تھیم ہے اور جس کا پاکستان اور بھٹو دونوں کے لئے بدنصیبی کی بات ہے۔ کافی تجربہ رکھتے ہیں، کسی ملک پر کیا گزرتی ہے اگر جنرل سٹہ کھیلنا شروع کرتے ہیں اور اس عمل کے دوران غیر ملکی طاقتوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ بھٹو کی زندگی جو ہو سکتا ہے کہ ان سطور کے لکھتے وقت خاتمے کے قریب ہو۔ اس نظریئے کا ثبوت ہے جسے وہ بڑے واضح انداز میں پیش کرتے ہیں کہ بالادستی اور فوجی بغاوت کی راہ جسے وہ ______ COUP - GEMONY کا نام دیتے ہیں، ایک ہی سامراجی سکّے کے دو رخ ہیں۔

بھٹو کا موقف یہ ہے کہ جولائی ۱۹۷۷ء میں حملہ کرنے سے بہت پہلے جرنلوں نے اپنی کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ ان کے منصوبے کی ابتداء مارچ انتخابات سے پہلے ہو گئی تھی اور بغاوت آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچی اور یہ فوج اور پی این اے اور ان دونوں اور غیر ملکی طاقت (یا طاقتوں) کے درمیان معاملات طے ہونے کا نتیجہ تھا۔ "غیر ملکی" سطح پر جو طے پایا تھا یہ تھا کہ پی این اے کو انتخابات جیتنے کے لئے "۳۰ کروڑ روپے ملیں گے اور اگر وہ ناکام ہو جائے تو بغاوت کے اقدام میں فوج کی حمایت کی جائے گی۔ اس کے بدلے نئے حکمران نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ ترک کر دیں گے جس کا معاہدہ بھٹو نے فرانس کے ساتھ کیا تھا۔ ملکی سطح پر یہ طے پایا تھا کہ فوج پی این اے کی انتخابی مہم کی حمایت کرے گی (اور بھٹو کے بیان کے مطابق مختلف طریقوں سے یہ حمایت کی گئی) اگر انتخاب میں کوشش ناکام ہو جائے تو فوج اقتدار میں آ جائے گی اور بعد میں پی این اے کو حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دے گی (لیکن ایک انتہائی جونیئر پارٹنر کی حیثیت سے) تاکہ فوجی حکومت میں ایک شہری رنگ کا اضافہ کیا جائے۔

اس سمجھوتے کو ثابت کرنے کے لئے بھٹو کی شہادت ناکافی اور سطحی ہے اور کسی عدالت میں ٹھہر نہیں سکتی لیکن ان کی یہ وضاحت معقول ہے کہ ان سے یہ مطالبہ کرنا غیر منصفانہ ہو گا کہ وہ پہلے جیل میں اور اس کے بعد موت کی کوٹھری میں اتنے طویل عرصے تک سب سے کٹے رہنے کے بعد اس بارے میں دستاویزی شہادت پیش کریں اور پاکستان کا قومی مفاد مانع ہے کہ وہ اپنے موجودہ حالات میں بھی وہ تمام باتیں خاص طور پر متعلقہ غیر ملکی طاقت کا نام ظاہر کر دیں، جو وہ کر سکتے ہیں۔

مسٹر بھٹو صدر پاکستان کی حیثیت سے چین کے وزیر اعظم چو این لائی (مرحوم) سے مذاکرات کر رہے ہیں

صدر سوکارنو نے کہا تھا "بھٹو تیسری دنیا کے عظیم مجاہدِ آزادی ہیں"

بہرحال یہ بات کم متعلق ہے کہ ان سے پوچھا جائے کہ کیا وہ درست کہہ رہے ہیں۔ یہ نسبت اس کے کہ ان سے یہ پوچھا جائے کہ کیا وہ پاکستان کی سیاست میں غیر ملکی اثرات اور فوجی طاقت کے کردار کی مذمت کرنے میں مخلص ہیں۔ اس معاملے میں ان کا ریکارڈ خلط ملط ہے۔ حکومت میں اپنے ابتدائی دور میں بھٹو نے پاکستان کے فوجی حکمرانوں میں سب سے زیادہ معروف حکمران فیلڈ مارشل ایوب خان کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا تھا اور ۱۹۶۱ء میں ایک بیان میں ایوب خان کو "لنکن سے بڑا۔ لینن سے بڑا۔ ہمارا اتاترک اور ایک صلاح الدین" قرار دیا تھا۔ اس بات پر یقین کرنے کی وجوہات موجود ہیں کہ ۴ سال بعد ۱۹۶۵ء میں ایوب خان پر بھارت کے خلاف جنگ کرنے پر زور دینے میں وہ مشرقی پاکستان کا دفاع چین پر چھوڑ دینے پر قانع تھے۔ بالادستی کا قبول کرنا اس سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔

پانچ سال بعد بھی وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ وہ بالادستی اور فوجی بغاوت کی راہ کا دو رخہ سکہ اپنی جیب میں ڈال لیں۔ یہ فوجی جنرلوں کی حمایت اور غیر ملکی پشت پناہی کے ساتھ (جس کی انہوں نے خود بڑی ناز کی تھی) ہی تھا کہ وہ بیس دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔

عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلے نشریئے میں انہوں نے فخریہ طور پر کہا کہ "مجھے عوام نے منتخب کیا ہے" کیونکہ انہوں نے مغربی بازو میں انتخابات جیتے تھے اور جب انہوں نے کہا کہ "میں من مانے طریقے پر عوام پر مسلط نہیں کیا گیا ہوں"۔ تو اس میں بجا طور پر یہ مفہوم مضمر تھا کہ ان کے ۲ پیشرو صدر ایوب خان اور یحییٰ خان اس طرح مسلط کئے گئے تھے لیکن یہ انتخابات نہیں تھا جس نے انہیں ۱۹۷۱ء میں صدر بنایا تھا بلکہ اسے امریکہ اور دو اعلیٰ ترین فوجی افسروں، چیف آف دی آرمی جنرل اسٹاف لفٹیننٹ گل حسن (جنہیں انہوں نے جس قدر جلد ممکن ہوا ترقی دے کر کمانڈر انچیف بنا دیا تھا) اور ایئر مارشل رحیم خان کی حمایت حاصل تھی۔

اقوام متحدہ میں بنگلہ دیش پر بحث کو چھوڑ کر جب بھٹو ملک کے لئے روانہ ہوئے تو انہیں ان اطلاعات کا علم تھا کہ یحییٰ خان کو دست برداری پہ آمادہ کرنے کے لئے فضائیہ کے طیاروں نے ان کے محل کو "بز کیا تھا" اور ان کے راولپنڈی پہنچنے سے پہلے جنرلوں کو علم تھا کہ وہ واشنگٹن میں صدر نکسن اور سیکریٹری آف اسٹیٹس ولیم راجرز سے "کلیرنس" کی ملاقاتوں سے گزر آئے تھے۔ ان کے اس قدر تیزی اور آسانی سے ان کے اقتدار پر قبضہ کرانے والے عناصر یہی تھے وہ ۲۰ دسمبر کو دوپہر سے پہلے یحییٰ خان سے فیصلہ کن ملاقات کے لئے سیدھے ایوانِ صدر پہنچے تھے اور چند گھنٹے کے بعد جب باہر نکلے تو ان کی کار پر صدارتی جھنڈا لہرا رہا تھا۔

لیکن بھٹو، پہلے مسٹر جناح اور پہلے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان (یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انہیں قتل کر دیا گیا تھا) کو چھوڑ کر باقی تمام سیاستدانوں کی بہ نسبت اس بات کے لئے زیادہ توصیف کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اصرار کیا کہ سیاسی اقتدار عوام کے پاس ہونا چاہیئے۔ مسلح افواج کے پاس نہیں اور یہ کہ طویل مدت میں صرف ایک آزاد خارجہ پالیسی ہی مفید ثابت ہوتی ہے۔

ان عقائد کے پہلے حصے پر انہوں نے ۱۹۶۰ء کے وسط سے اور اس کے بعد فائدہ اٹھاتے ہوتے عمل کیا جبکہ انہوں نے ایوب خان کے اقتدار کو طلباء کی طاقت سے ہلایا اور اس کے بعد اعلیٰ قسم کے عوامی رہنما بن کر یکے بعد دیگرے ۲ انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی لیکن انہوں نے اس اعتقاد سے روگردانی کی جب انہوں نے شیخ مجیب کو ان کے اپنے انتخاب کے جادو کی فصل کاٹنے دینے سے انکار کر دیا اور ۸ سال قبل پاکستان نے اس روگردانی کی بڑی المناک قیمت ادا کی اور ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے ہی بھٹو کو بھی ایسی ہی قیمت ادا کرنی پڑ جائے۔ اگر یہ روگردانی نہ ہوتی تو شاید پاکستان کی تاریخ اور اس کے دو انتہائی سحر کار رہنماؤں کی زندگی مختلف ہوتی۔

ایک آزاد خارجہ پالیسی کی قدر و اہمیت کے بارے میں ان کے اعتقادات کا دوسرا حصہ ان کی خارجہ پالیسی میں تعمیر ہو رہا تھا کہ وہ معزول ہو گئے۔ اپنی اپیل سے متعلق بیان میں بھی وہ ہندوستان کی غیر وابستگی کی تعریف کرتے ہیں اور صدر ضیاء پر زور دیتے ہیں کہ وہ سینٹو سے نکل آئیں۔ ہو سکتا ہے کہ بھٹو درست کہتے ہوں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ غیر ملکی سطح پر ان کے زوال کے لئے جو معاملے پایا اس کی وجوہات کا ایک حصہ یہ بھی تھا لیکن وہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے ایک پہلو پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ ہے ہندوستان کی دشمنی کی حد تک مخالفت جس سے ماضی میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے دو پہلو نکلتے رہے ہیں جس میں بالادستی اور فوجی بغاوت کی راہ بھی شامل ہے۔

بھٹو کے اقدامات کا ریکارڈ کچھ بھی ہو، پاکستان کی خرابیوں کے بارے میں ان کی تشخیص نہ صرف ان کے لئے یا پاکستان کے لئے بلکہ جمہوری سیاست کی روایات کو فروغ دینے کی کوشش کرنے والے تیسری دنیا کے ممالک کے لئے بھی سبق آموز ہے۔ بھٹو کے خلاف

الزامات اور ان کے جوابی الزامات دونوں یکساں طور پر ثابت کرتے ہیں کہ پاکستان کا سیاسی نظام مطلق العنان حکمرانی، چاہے وہ شہری ہو یا فوجی، اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ پابندیوں کی ان روایات کو یکسر کھو چکا ہے جو کسی سیاسی طور پر صحت مند سماج میں انتظامی اختیار کے آمرانہ استعمال کی بہترین ضمانت ہوتی ہیں۔

تیسری دنیا کے رہنماؤں کے لئے سب سے زیادہ کار آمد بھٹو کے بیان کا وہ حصہ ہے جس میں انہوں نے پاکستان کے سیاسی نظام میں مارشل لاء کی طرف رجحان کا شاندار تجزیہ کیا ہے۔ بھٹو کسی اور زندہ یا مردہ سیاستدان کے مقابلے میں پاکستان کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ مارشل لاء کی طرف اس کے رجحان کو اور بھی زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں کیونکہ وہ مختلف اوقات میں اس میں شریک اور اس کے شکار رہے ہیں۔ اس سے ان کو یہ خصوصی سند ملتی ہے کہ ترقی پذیر دنیا کو تنبیہہ کریں اور فوجی بغاوت کی راہ، وہ اصطلاح جو انہوں نے اپنے تیز ادراک اور لطفِ زبان سے وضع کیا ہے، کے خلاف یہ تنبیہہ زبردست الفاظ میں کرتے ہیں۔

وہ فوجی بغاوت کی راہ کے خطرے کو غیر ملکی بالادستی کے ساتھ ساتھ رکھتے ہیں اور عوام جمہوری اور فطری تمناؤں پر ان دونوں قسم کے جبر کی مجموعی طور پر مذمت کرتے ہیں، وہ فوجی بغاوت کی راہ کی زیادہ مذمت کرتے ہیں کیونکہ ان کے قول کے مطابق "فوجی بغاوت کی راہ" وہ پل ہے جس کے ذریعے غیر ملکی بالادستی اندر داخل ہوتی ہے" وہ مارشل لاء کے ان تمام ادوار کا تجزیہ کرتے ہیں جن سے پاکستان گزر رہا ہے اور دکھاتے ہیں کہ ان کی تخلیق کرنے والی غیر ملکی طاقت نے کس طرح ان میں سے ہر ایک کو استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ پاکستان کے سیاسی نظام کا ایسا ضعف طاقت اور اقتدار کا ایسا خاتمہ تھا کہ ملک ٹوٹ گیا۔

مشرقی بازو کو مغربی فوجی ذہن کی غیر انسانی بربریت کا نشانہ بنایا گیا جو اس قدر وحشی ہو گیا تھا کہ وہ یہ بڑ بھی ہانک سکتا تھا کہ ایک بنگالی عورت کی آبروریزی صرف "بنگالی خون کو پاک کرنا ہے" (اس بڑ کے سلسلے میں بھٹو ایک سرکاری رپورٹ کا حوالہ دیتے ہیں) لیکن مارشل لاء ذہنیت نے مغربی بازو پر جو المیہ طاری کیا ہے وہ کم تباہ کن نہیں ہے۔ اس نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جیسے کہ مریض اس بات کا قائل ہو جائے کہ وہ صرف زہر کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے اور جس کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ اسے ہلاک کر رہا ہے۔

صدر ضیاء نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو "آپریشن فیئر پلے" کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کیا۔ اس دکھاوے کے ساتھ کہ انہوں نے صرف ۹۰ دن کے اندر منصفانہ انتخابات کرانے کے لئے یہ قبضہ کیا ہے۔ فوج اس سے زیادہ کچھ نہیں کرے گی کہ وہ اکھاڑے کی صفائی کرے اور اس کو صرف اس غرض سے سنبھالے رکھے کہ انتخابات ایک منصفانہ مقابلہ بن جائیں لیکن اس کے بعد انہوں نے اپنا ذہن بدل لیا اور کہا کہ انتخابات صرف اس وقت منعقد کئے جا سکتے ہیں جب یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ "مثبت نتائج" پیدا کریں گے۔

چونکہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ "مثبت نتائج" کیا ہیں انہوں نے خود کو ہی جج بنا لیا ہے اور یہ فیصلہ بھی اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے کہ کس وقت انتخابات کے انعقاد سے یہ نتائج پیدا ہونے پر اعتبار کیا جا سکتا ہے، صرف وہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اگر کبھی انتخابات ہونے تو کس وقت ہونے چاہئیں۔ صدر کس طرح اس بات کی ضمانت حاصل کریں گے۔ اگر انتخابات منعقد

بھٹو، امریکہ کے سابق صدر نکسن کے ہمراہ

ہوں تو وہ مثبت نتائج بھی پیدا کریں۔ یہ بات فہم سے بالاتر ہے لیکن اس لمحے کا انتظار کرتے کرتے جنرل ضیاء نے ابتدائی ۹۰ دن کو ۱۲ سے ضرب دے لیا ہے۔

انتخابات کیوں نہیں ہوتے؟ شاید اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ صدر ضیاء نہ تو ان پر یقین رکھتے ہیں اور نہ کبھی رکھا ہے۔ ان کے اصل عقائد کا اظہار تو ان کے اپنے ایک تبصرے سے ہوتا ہے جس کا حوالہ بھٹو نے اپنے اپیل سے متعلق بیان میں دیا ہے۔ صدر ضیاء جو ابھی تک صدر اور وزیر اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ چیف آف دی آرمی اسٹاف بھی ہیں۔ ان سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ "یہ دستوری ہو یا نہ ہو، پاکستان میں اقتدار ہمیشہ اس شخص کے ہاتھ میں ہوگا جو چیف آف دی آرمی اسٹاف کی کرسی پر بیٹھا ہوگا" چونکہ بھٹو اس سے متفق نہیں ہیں اس لئے جنرل کسی ایسے انتخاب کے منعقد کرنے کی اجازت نہیں دیں گے جب تک کہ وہ اس پر مجبور نہ کر دیئے جائیں جن سے بھٹو یا ان کے حامیوں کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کا موقعہ ہو۔ یہ کوئی "مثبت نتیجہ" نہیں ہوگا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ یہی وہ شخص تھے جنہیں بھٹو نے اس کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا تھا جو ۱۹۷۳ء میں فوجی بغاوت کے ذریعے بھٹو کا تختہ الٹنے کی پہلی کوشش کی تحقیقات کے لئے قائم کی گئی تھی (ماضی پر نظر ڈالی جائے تو اتنی ہی ستم ظریفانہ بات یہ ہے کہ ترکی میں ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت کا تختہ الٹنے والے جنرلوں نے وزیر اعظم مندریس، وزیر خارجہ زورلو اور وزیر مالیات کریٹیکن کو سزائے موت سنا دی تھی تو صدر ایوب نے بھٹو کو اپنے خصوصی نمائندے کے طور پر انقرہ بھیجا تھا کہ وہ فوجی جنرلوں کو سمجھائیں کہ سزائیں نہ دی جائیں۔ بھٹو ناکام رہے اور سزاؤں پر عمل درآمد ہو گیا) جنرل ضیاء نے تحقیقاتی کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے جو کچھ بھی سیکھا لازماً بہت اچھی طرح سیکھا ہوگا۔

فوج بمقابلہ عوام

فوجی لیڈر اس وقت تک انتخابات نہیں کراتے نہ ہی جنرل ضیاء کرائیں گے جب تک کہ وہ مجبور نہ ہو جائیں۔ اس دوران مارشل لاء اپنا خراج وصول کرتا رہے گا اور وہ درحقیقت کس طرح یہ کام کر رہا ہے اس کو اتنے واضح طور پر بیان کر کے بھٹو نے زبردست خدمت انجام دی ہے بھٹو کے اس بیان میں ایسے گہرے مشاہدات بکھرے ہوئے ہیں کہ پاکستان میں ملٹری ازم کا کینسر کیسے پھیلا۔ ایوب خاں کے "ہم برٹش والوں جیسے ہیں" کے کمپلیکس سے لے کر، ایک ایسی حماقت جسے بھٹو حسن مذاح کے ساتھ بیان کرتے ہیں، فوجی بحث کی کبھی نہ مٹنے والی بھوک تک (جس کی تسکین بھٹو نے بھی کی، جیسا کہ جنرل ضیاء بلا ارادہ ستم ظریفی کے ساتھ گواہی دیتے ہیں) اور اس کے ساتھ ساتھ اس جیسی کبھی نہ مٹنے والی فوج کی بالائی سطح کی وہ بھوک اقتدار کے لئے اقتدار کی طلب ہے۔ اولاً جنرلوں کی بھوک سیاسی اقتدار کے لئے اور اس کے بعد کرنلوں اور میجروں کی انتظامی اختیارات کی بھوک جو مقامی با اختیار اداروں تک پہنچتی ہے۔

لیکن قاری کو فہم و فراست کے ان بکھرے ہوئے جواہر پاروں کی تلاش میں لمبے بیان کو چھاننا نہیں پڑتا۔ ان تمام کی مجموعی

مغربی پاکستان کے واقعات، تیسری دنیا کے کسی ملک میں بھی دہرائے جا سکتے ہیں

معنویت کو بلوچستان کے بارے میں چند صفحات میں انتہائی خوبی کے ساتھ مرکوز کر دیا گیا ہے۔ بلوچستان پاکستان کا وہ حصہ جو پاکستان کے کسی بھی دوسرے حصے کے مقابلے میں سب سے زیادہ فوجی حکومت کے تحت رہا ہے۔ کبھی نام اور کام دونوں کے اعتبار سے اور کبھی صرف کام کے اعتبار سے۔ یہاں بھی بھٹو اس جرم میں نہ تنہا ہیں جس کی آج وہ خدمت کر رہے ہیں لیکن وہ اپنے اسپیشل سیکریٹری راؤ عبدالرشید کا ایک نوٹ نقل کرتے ہیں جو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ یہ کسی لائبریری ماڈل کو ترازو پر رکھنے کا بیان ہے کہ سیاست، انتظامیہ اور پوری سوسائٹی پر کیا گزرتی ہے جب تمام اقدار فوجی ایڑھی کے نیچے کچلے جاتے ہیں۔

بلوچستان کے مسئلے پر قرطاس ابیض کے مصنفوں اور بھٹو کے درمیان الزامات اور جوابی الزامات کا تبادلہ اور اس بدنصیب صوبے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں راؤ عبدالرشید کا فراہم کردہ ایکسرے جو سیاسی بصیرت اور ایک تجربہ کار منتظم کے غیر جانبدارانہ مشاہدے کا آمیزہ ہے۔ ان کا سیاسی المیہ نئی وسعتیں اختیار کر لیتا ہے۔

راؤ عبدالرشید مختصر مگر ٹھیک ٹھیک طور پر بیان کرتے ہیں کہ کس طرح فوج بلوچستان میں "انتہائی ناپسندیدگی" اور "آخری چارۂ کار" کے طور پر لائی گئی تھی۔ وہ وضاحت کرتے ہیں کہ بلوچستان میں فوجیں اتارنے کا جواز کس طرح ہوتا اگر یہ "تیز رفتار، متعینہ آپریشن" رہ پاتا۔ اس کے بعد وہ وضاحت کرتے ہیں کہ وہ کیسے "خود بخود جاری رہنے والا آپریشن" بن گیا۔ اور کس طرح "فوج کا طویل قیام کئی شعبوں میں کیسے مخالفانہ اثرات پیدا کر رہا ہے" اسپیشل سیکریٹری اس میں مزید اضافہ کرتے ہیں کہ "بدنصیبی یہ ہے کہ اس ملک میں فوج کے شہری انتظام میں ملوث ہونے کی روایت بڑی قدیم ہے۔"

قرطاس ابیض ان تمام باتوں کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے بعد آگے کہتا ہے "شہری معاملات میں فوج کے کردار کے بارے میں راؤ رشید کے ان جائز تحفظات کے باوجود یہ ریکارڈ کی بات ہے کہ بھٹو حکومت نے بلوچستان سے فوج کی بتدریج واپسی کی پالیسی پر عمل نہیں کیا" بھٹو نے اس کا جواب دہشت کے احساس کے ساتھ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "یہ زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہے۔ میں نے کئی موقعوں پر واپسی کے منصوبوں پر زور دیا لیکن ہر بار مجھ سے درخواست کی گئی کہ اس عرصے میں چند ماہ کا اضافہ کیا جائے۔ یہ صداقت ہے، حقیقی اور تاریخی ریکارڈ ہے جبکہ اس کے مقابلے میں حکومت کی گھڑی ہوئی داستان ہے۔ کیا اب بھی ۔۔۔۔ حکومت نے بلوچستان سے فوجیں واپس لائی ہیں؟ میں ہی نہیں بلکہ بلوچستان کے عوام اس سوال کا ایک دیانتدارانہ جواب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

ہو سکتا ہے یہ ایسا ہی معاملہ ہو جیسے پیالی کیتلی سے کہے کہ وہ کالی ہے۔ کیونکہ بلوچستان میں بھٹو کا ریکارڈ فوج کے ریکارڈ سے بہتر نہیں ہے۔ لیکن، اگر بھٹو ۔۲۰ صفحات پر مشتمل بیان میں بلوچستان میں ہونے والے واقعات کے بارے میں ان کے اپنے اور راؤ عبدالرشید کے تجزیئے سے زیادہ کوئی اور بات نہیں ہے تب بھی یہ بیان پولیٹیکل سائنس کی کسی بھی

مسٹر بھٹو، شاہ خالد کے ساتھ

لائبریری میں ایک بہتر اضافہ ہوگا۔ اگر پاکستان کے فوجی حکمران سمجھدار ہوتے تو وہ اس کو دبانے کی بجائے ہر فوجی اسکول میں اس بیان کا پڑھا جانا لازمی قرار دیتے۔ کیونکہ یہ اس موضوع کا بہترین مطالعہ فراہم کرتا ہے کہ کوئی فوج جب سیاست میں ٹانگ اڑانا شروع کرتی ہے، ایسا فریضہ جس کے لئے: اس کے پاس مہارت ہے نہ تجربہ نہ ہی استعداد اور یہ چیزیں اس وقت تک حاصل نہیں کی جا سکتیں جب تک کہ ایک لڑاکا قوت کی حیثیت سے اس پر جو اصل فرض عائد ہوتا ہے اس کی طرف سے غافل ہو جائے۔ ایسی صورت میں وہ سیاسی نظام کو نقصان پہنچانے کے علاوہ خود اپنے وجود کو کتنا نقصان پہنچاتی ہے۔

بلوچستان میں فوج کے اس زوال کو راؤ عبدالرشید نے بہت اچھی طرح بیان کیا ہے جبکہ ایک بڑے بلوچ رہنما غوث بخش بزنجو نے یہ دکھایا ہے کہ بلوچستان میں فوج کی کبھی نہ ختم ہونے والی موجودگی اور اس کے خلاف بلوچوں کے ردعمل کی وجہ سے کس طرح مرکز کا اختیار ختم ہوا۔ غوث بخش بزنجو جنہیں پاکستان کے خلاف بلوچستان کی ناراضگی کا واحد معتدل رہنما سمجھا جاتا ہے وہ اب بلوچستان کے لئے خود اختیاری کے ایسے اختیارات کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر یہ تمام یونٹوں کو دے دیئے جائیں، اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک یونٹ کو دیئے جائیں اور دوسرے یونٹوں کو ان سے محروم رکھا جائے، تو پاکستان جلد ہی صفحۂ ہستی سے غائب ہو جائے گا۔

بزنجو نے اپنے خیالات کا اظہار تفصیلی بیانات میں کیا ہے جو اس علاقے کے مستقبل کے لئے کافی اہم ہیں۔ ان میں ایسی معقول انتہاپسندی ہے کہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ افغانستان کے انقلاب کے بعد کیا سوویت یونین کو اس بات کی اجازت دی جانے والی ہے کہ وہ بحیرۂ عرب کے پانی میں داخل ہونے کے اپنے خواب کی تکمیل کرے۔

بلوچستان سے ملنے والے سبق میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے اگر اسے اس وقت کے مشرقی پاکستان میں گزرنے والے واقعات کے سلسلے میں بھٹو کے بیان کی روشنی میں دیکھا جائے اور جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس وقت مغربی پاکستان میں وہی کچھ ہو رہا ہے اور تیسری دنیا میں کہیں بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہاں کے فوجی رہنما بھی وہی کچھ کرنے کی کوشش کریں جو پاکستان کے فوجی رہنما کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک اور انتہائی دور اندیشانہ تجزیئے میں بھٹو کہتے ہیں کہ سول سروس پر اس وقت دست درازی جب تک کہ وہ "غائب ہو جائے ۔۔۔۔ ملک کے اتحاد اور استحکام کو داؤ پر لگا کر خود کو برقرار رکھنے کی پالیسی کے حصے کے طور پر تمام مارشل لا حکومتوں کی کھلی پالیسی رہی ہے۔"

۱۹۷۱ء میں شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنی انتخابی فتح کے ثمرات سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر کے بھٹو نے خود بھی ملک کو توڑنے میں حصہ لیا لیکن اس وقت کے مشرقی پاکستان میں مغربی بازو کے خلاف شدید ناراضگی جس نے اس دھماکے

جناب بھٹو، سری لنکا کی مسز بندرانائیکے کے ہمراہ

کو جب وہ واقع ہوا اس قدر تباہ کن بنا دیا تھا، اسے اس فوج کے اعمال نے ہوا دی جو مغربی فوج تھی اور جس نے مشرقی بازو کو بے رحمی کے ساتھ کچلا۔ فوج نے درحقیقت کیا کیا تھا اس کا علم اس وقت تک نہیں ہو سکے گا جب تک کہ پاکستان حمود الرحمٰن رپورٹ جاری نہ کرے یا کوئی اور اسے ظاہر نہ کر دے لیکن بھٹو جو کچھ کہہ چکے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رپورٹ کتنی ضرر رساں ہوگی۔

"اس وقت بھی حمود الرحمٰن رپورٹ پر میرا کھلا تبصرہ مسلح افواج کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گا"، وہ جنرل ضیاء کو تنبیہہ کرتے ہیں۔ وہ اسے "مسلح افواج اور فوجی اشرافیہ ایک سخت فرد جرم ......، اور" آبرو ریزی۔ ڈاکے اور لوٹ مار کی ایک داستان،، قرار دیتے ہیں۔ بھٹو نے جیل سے مطالبہ کیا ہے کہ جنرل ضیاء کو اس رپورٹ میں ردّ و بدل کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔

اس وقت کے مشرقی پاکستان میں فوج نے جو کچھ کیا اس کے بارے میں فرد جرم پر بھٹو اس واضح تنبیہہ کا اضافہ کرتے ہیں کہ فوج کی حکمرانی کا مسلسل جاری رہنا بچے کھچے پاکستان میں اس سے بھی زیادہ شدید بحران پیدا کر رہا ہے: آج پاکستان کو جس بحران کا سامنا ہے اس سے کہیں زیادہ شدید اور زیادہ تباہ کن ہے جتنا ۱۹۷۱ء کا بحران تھا،، بھٹو مزید کہتے ہیں کہ" ۱۹۷۰ء میں خطرہ تھا مشرقی پاکستان ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ ۱۹۷۸ء میں خطرہ یہ ہے بچا کھچا پاکستان بھی جاتا رہے گا۔ ایک سطح پر مارشل لاء کے جاری رہنے کے قانونی نتائج ہیں اور دوسری سطح پر امن عامہ کے حوالے سے زیادہ خطرناک نتائج ہیں۔

۱۹۷۳ء کا آئین جو وہ واحد بنیادی قانون ہے جو پاکستان میں اس وقت نافذ تھا جبکہ مارشل لاء نے اسے غیر مؤثر کر دیا اور صرف یہی ایک قانون تھا جسے رائے دہندگان کی منظوری حاصل تھی۔ اسے مسلسل دبائے رکھنے کا مطلب یہ ہوگا، آئین خود بخود ختم ہو جائے چاہے اسے ابھی تک ختم نہ کیا گیا ہو۔ ایسی صورت میں پاکستان کا انحصار صرف ۱۹۴۷ء کے انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ پر رہ جائے گا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی بنیاد نہ ہوگی کیونکہ اس کی تشکیل کرنے والے یونٹ وہ خود مختاری حاصل کر لیں گے جو انہیں پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے حاصل تھی۔ تب بزنجو کا خواب جناح کے خواب کی جگہ لے گا۔

امن عامہ کی سطح پر، "پاکستان ۱۹۷۱ء کے بدترین دنوں سے زیادہ خانہ جنگی سے قریب ہے"، بھٹو مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد کے فسادات کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں فوج کا دعویٰ ہے کہ اس نے انہی فسادات کی وجہ سے مداخلت کی ہے۔ بھٹو جنرل ضیاء کو اس خطرے سے آگاہ کرتے ہیں کہ "میری زندگی سے زیادہ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اس بارے میں کسی غلط فہمی میں نہ رہیں پاکستان کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے"۔

مگر بھٹو کی سب سے زیادہ دور رس تنبیہہ تیسری دنیا کے ان ممالک کے لئے مخصوص ہے جو جمہوری عمل کی آلودگی اور سست رفتاری سے دل برداشتہ ہو کر مطلق العنانہ حکومت کی ترغیبات کی طرف جھکتے ہیں اور انہیں بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اس کے فوائد صرف خیالی یا زیادہ سے زیادہ مختصر مدت کے لئے ہوتے ہیں لیکن اس دوران جیسا کہ پاکستان کے معاملے میں ہے، ان ترغیبات کے آگے جھک جانا عادت بن جاتا ہے۔

آج میرے ذہن میں کوئی اور سیاستدان نہیں آتا جس نے اس ہمہ گیر دوربینی کا مظاہرہ کیا ہو جس طرح کا مظاہرہ بھٹو نے دنیا بھر میں ہونے والی فوجی بغاوتوں کا جائزہ لیتے ہوئے کیا ہے یا کسی میں وہ گہرائی تک پہنچنے والی دانش کا حامل ہو جس کا وہ پاکستان میں فوجی بغاوت کی راہ کی جڑوں کو عریاں کرتے ہوئے مظاہرہ کرتے ہیں لیکن میں ایسے کئی باعمل سیاستدانوں کا تصور کر سکتا ہوں جو ان سہ ایک دوسرے مربوط تنبیہوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو بھٹو تیسری دنیا کے ممالک کو دیتے ہیں۔

"فوجی بغاوتیں قومی اتحاد کی بدترین دشمن ہیں"

"اگر فوجی بغاوت سیاسی ڈھانچے کا مستقل حصّہ بن جاتی ہے تو اس کا مطلب بکھرتے ہوئے آخری گلاب کی آخری پتّی کا ٹوٹنا ہوگا۔ اس کا مطلب اختتام ہے"

"پچھلے ۲۰ برسوں کے واقعات نے مجھے اس غیر مبہم نتیجے تک پہنچایا ہے کہ تیسری دنیا کے اتحاد اور ترقی کو جس چیز سے سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہے وہ فوجی بغاوت کی راہ ہے"

"فوجی بغاوت کی راہ وہ پل ہے جس پہ چل کر بالادستی ہمارے ملکوں کو دبوچنے کیلئے آتی ہے"

ان تمام معاملات کے بارے میں بھٹو ہندوستان اور پاکستان کی پالیسیوں کا تقابل کرتے ہیں اور ان تمام کو وہ اپنے نقل نہ کئے جا سکنے والے انداز میں سمیٹتے ہیں

"اگر ہندوستان پاکستان کی طرح مارشل لاؤں اور فوجی آمریتوں کا عذاب سہتا تو ہندوستان اب تک ۳، ۴ ٹکڑوں میں بٹ گیا ہوتا ہندوستان پاکستان کے مقابلے میں زیادہ غیر ہم آہنگ ہے لیکن ہندوستان کو اس کی جمہوریت کے شور اور انتشار نے یکجا رکھا ہے"

یکجا رکھا ہے پر بھٹو آزاد رکھا ہے کا اضافہ کر سکتے تھے کیونکہ یہ جمہوریت ہی تھی جس نے ہندوستانی قوم پرستی کو اتنا شور مچانے کی اجازت دی کہ ہر ایسے مداخلت کار کو خوفزدہ کر کے بھگا دے جس نے بالادستی کا ساز و سامان اپنے ہمراہ لانے کی کوشش کی۔

بھٹو ان تمام باتوں میں مخلص ہیں یا وہ صرف ذہانت آمیز فقرے وضع کر رہے ہیں؟ کیا وہ جمہوری عقائد کی بنا پر فوجی

حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں یا صرف اس وجہ سے کہ انکے اقتدار کے لئے صرف یہی ایک چیلنج ہے؟ وہ اپنا تختہ الٹے جانے کا الزام "ایک غیر ملکی طاقت" پر کیوں لگا رہے ہیں؟ اس لئے کہ یہ سچ ہے؟ یا اس لئے کہ یہ ایک ایسا پیش پا افتادہ کتا ہے جس پر کسی بھی دن ہنٹر برسائے جاسکتے ہیں؟ اگر بھٹو زیادہ عرصہ زندہ رہتے ہیں تو انہیں اپنے عمل سے ان کا جواب دینا ہوگا اگر جوابات ان کے حق میں ہوں تو ان کے اقدامات کو لازماً ان سے بہت زیادہ بہتر ہونا پڑے گا جو ماضی میں ان کے اقدامات تھے لیکن فی الحال وہ یہ سوالات اٹھا رہے ہیں اور دوسروں کو ان کا جواب دینا ہے۔

انتہائی تکلیف دہ سوال جو وہ پوچھتے ہیں اور انہی الفاظ میں یہ ہے کہ "نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کا کیا بنا؟" ان کا یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے کہ وہ ایک غیر ملکی طاقت جس سے اس کی مراد امریکہ ہے (گو کہ وہ مشرقِ وسطے کے ایک شریکِ کار کی طرف اشارہ کرتے ہیں) ایک سمت اور دوسری سمت جنرل ضیاء اور پی این اے کے درمیان ایک سازش کے شکار ہیں۔ اور یقیناً جو آخری سوال وہ کرتے ہیں یہ ہے کہ "میری بقاء کے کیا امکانات ہیں؟" اسے وہ اس انداز میں صرف اس لئے پیش نہیں کرتے کہ "اپنے مستقبل کے بارے میں بات کرنا میرے وقار اور خود داری کے منافی ہے" لیکن وہ یہ تجویز کرنے کے لئے بہت کچھ کہتے ہیں کہ وہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے رہنماؤں کی طرف سے ان کی جانب سے مداخلت کے لئے کہہ رہے ہیں۔

بھٹو کہتے ہیں کہ "اگر اندر سے غدّاری نہ ہوتی تو مجھے ان حالات سے نہ گزرنا پڑتا جن سے میں گزر رہا ہوں" ان کا جو مطلب ہے یہ ہے کہ:

(i) جنہوں نے فیصلہ کیا تھا پاکستان کو نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ (مختصر یہ کہ بم) سے محروم کرنا چاہتے تھے انہوں نے ان کا تختہ الٹ دیا کیونکہ وہ اس سے دست بردار نہیں ہوئے۔

(ii) تختہ الٹنے کے بعد ان لوگوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ بھٹو کو جیل میں ڈال دیتے کیونکہ دوسری صورت میں عوام انہیں دوبارہ مسندِ اقتدار پر بٹھا دیتے۔

(iii) بھٹو کو جیل میں ڈالنے کے بعد وہ انہیں پھانسی دینا یا انہیں توڑ دینا یا انہیں غیر معینہ مدت کے لئے جیل میں رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ دوسری صورت میں وہ کسی بھی روز دوبارہ برسرِ اقتدار آسکتے ہیں۔

(iv) بیرونی طاقتوں کے لئے ایسا کرنا اس لئے ممکن ہوا کہ انہیں پاکستان کے اندر شریکِ کار مل گئے۔

(v) اندرونی شریکِ کاروں نے ان سے غدّاری کی کیونکہ انہیں ایسا کرنے کے لئے رشوت دی گئی تھی۔ پی این اے کو رقم ملی اور چیف آف آرمی اسٹاف کو خواہشِ اقتدار کی تکمیل ملی۔

"پیچھے نہیں ہٹتے تو برسرِ اقتدار نہیں رہو گے"

ـــــ بھٹو کو دھمکی

ان الزامات کی پشت پر جو شہادت ہے وہ کتنی مضبوط ہے؟ کسی جواب کے لئے الزامات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینا پڑے گا مگر مختصراً میں یہ کہوں گا کہ واقعات کے بارے میں شہادت بہت اچھی ہے لیکن ان کے پس پردہ محرکات کے بارے میں اطمینان بخش نہیں ہے۔

بھٹو اپنے اس واضح دعوے میں حق بجانب ہیں کہ وہ اس قابل تھے کہ انہوں نے فرانس سے وہ معاہدہ کیا جس کے ذریعے پاکستان کو ایک نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ ملتا۔ وہ اپنے اس دعوے میں بھی حق بجانب ہیں جو ان کی تعلّیوں میں مضمر ہے، گو کہ وہ واضح الفاظ میں اس کا ذکر نہیں کرتے کہ یہ پلانٹ مل جاتا،

مسٹر بھٹو، حجرِ اسود کو بوسہ دے رہے ہیں

تو پاکستان کو بم تیار کرنے کی تکنیکی استعداد مل جاتی کیونکہ پلانٹ میں یہ صلاحیت ہے کہ اسلحہ کی تیاری میں استعمال ہونے کے قابل پلوٹونیم تیار کرسکے۔

اس بات کی بے انتہا، کافی باوثوق اور تقریباً کھلی ہوئی شہادت موجود ہے کہ امریکہ نے بھٹو اور فرانس دونوں پر زبردست دباؤ ڈالا کہ وہ اس معاہدے کو عملی جامہ نہ پہنائیں اور اس دباؤ کے نتیجے میں فرانس نے پاکستان پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی، لیکن صرف بھٹو کا تختہ الٹنے کے بعد، پلانٹ میں ایسے ردّ و بدل پر آمادہ ہو جائے کہ وہ اسلحہ کی تیاری میں استعمال ہونے سے قابل پلوٹونیم پیدا کرنے کے قابل نہ رہے۔

اس بات کی شہادت بھی موجود ہے کہ بھٹو کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر انہوں نے یہ پلانٹ اس شکل میں حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی کہ وہ اسلحہ کی تیاری میں استعمال ہونے والا پلوٹونیم تیار کرسکے تو ان کا تختہ الٹ دیا جائے گا اور انہیں خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس دھمکی کے ثبوت کے اور دوسرے ممکنہ ذرائع کے علاوہ دو ذرائع ہیں جو اس کی تائید کرتے ہیں۔ امریکہ کی ٹمپل یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کی اسسٹنٹ پروفیسر شیریں طاہر خیلی "ایشین سروے (موسم گرما ۱۹۷۸ء)" میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں کہتی ہیں کہ اس معاہدے کے موضوع پر ان کی تحقیقات کے دوران "ایک ذریعے" نے انہیں بتایا کہ "رخصت ہونے والے امریکی سفیر (اسلام آباد میں) اس حد تک گئے کہ انہوں نے کسی لحاظ کے بغیر بھٹو سے کہا کہ اگر وہ پیچھے نہیں ہٹے تو وہ مزید برسرِ اقتدار نہیں رہیں گے"، کہا جاتا ہے کہ اسی تبادلۂ خیال کے بعد امریکہ نے مارچ ۷۷ء کے انتخابات اور اس کے بعد ہونے والے احتجاج میں حزبِ اختلاف کی مدد کی۔

دوسرا ذریعہ بھٹو کے بیٹے کا بیان ہے۔ اپنے بیان کے دوران وہ بڑا واضح بیان دیتے ہیں۔ یہ اتنا واضح اور اتنا قائل کر دینے والا ہے کہ اس پر جعلی ہونے کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے اپنے وزیر پیداوار نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر بھٹو نے ری پروسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے پر اصرار کیا تو ان کا عہدہ اور خود ان کی ذات خطرے میں پڑ جائے گی۔

بھٹو کی شہادت اور مس طاہر خیلی کی شہادت بالواسطہ شہادتیں ہیں اور آزادانہ طور پر تصدیق کے قابل نہیں ہیں لیکن بعد کے واقعات ان دونوں کی تائید کرتے ہیں۔ بھٹو سے ان کا عہدہ چھن گیا اور اب جان چھن جانے کا خطرہ لاحق ہے فرانس نے کچھ عرصے تک امریکی دباؤ کا مقابلہ کرنے کے بعد معاہدے میں" ایسے ردّ و بدل کی تجاویز پیش کیں جن سے یہ پلانٹ اس قابل نہ رہے کہ وہ اسلحہ کی تیاری میں کام آنے والا پلوٹونیم پیدا نہ کرسکے اور پچھلے موسم گرما کے بعد سے فرانس ان تبدیلیوں کے لئے پاکستان پر سخت دباؤ ڈال رہا ہے لیکن نہ تو اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ اگر بھٹو برسرِ اقتدار رہتے

ملک کے اتحاد اور استحکام کو داؤ پر لگانے کی پالیسی

تو وہ اس قابل ہوتے کہ پاکستان کو ایک جوہری ہتھیار رکھنے والا ملک بنا سکیں نہ ہی اس کا کوئی ثبوت ہے کہ جنرلوں نے اس پلانٹ میں کانٹ چھانٹ کی سازش کی یا انہوں نے اپنی بغاوت کے لئے امریکہ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا۔

پاکستان کو جوہری ہتھیار رکھنے والا ملک بنانے کا بھٹو کے جذبے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ مئی ۱۹۷۴ء میں پوکھاراں کے مقام پر ہندوستان نے ایٹمی دھماکہ کیا تو انہوں نے کہا کہ پاکستان "گھاس کھا کر بھی بم بنائے گا"۔ اپنے موجودہ بیان میں بھی وہ شیخی بگھارتے ہیں کہ اس کا تختہ نہ الٹا جاتا تو وہ اسلامی تہذیب کو "بھرپور جوہری استعداد" فراہم کر کے اسے ہندو، عیسائی اور یہودی تہذیبوں کے برابر لا کھڑا کرتے (انہوں نے بدھ اور چینی تہذیبوں کا ذکر کیوں چھوڑ دیا اس کی وجہ وہی بہتر جانتے ہیں) "بھرپور استعداد" کے لئے ان کی خواہش کے بھی بالواسطہ ثبوت ہیں۔ پاکستان کا جوہری پروگرام جو بذات خود ملک کے مالی وسائل اور عمومی تکنیکی صلاحیت سے بہت زیادہ ہے، وہ کم از کم آئندہ دس بیس سالوں کے لئے تجارتی اور تکنیکی اعتبار سے معقول نہ ہوتا۔ سیاسی اعتبار سے یہ بامعنی تو ہوتا لیکن صرف بم بنانے کے ایک ذریعے کی حیثیت سے۔

لیکن یہ بھی پاکستان کو "بھرپور استعداد" فراہم نہ کرتا کہ پاکستان کو پہلا اسلامی بم بنانے کا اعزاز حاصل ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے پلانٹ پر سخت ترین پابندیاں قبول کر لی تھیں ان پابندیوں کی حدود میں پاکستان اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ حاصل ہونے والے پلوٹونیم کا ایک ادنیٰ بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ جو کم از کم تجرباتی دھماکوں کے لئے ضروری ہے اور جس کے بغیر کوئی قابل بھروسہ اور قابل استعمال بم نہیں بنایا جا سکتا نہ ہی سودا بازی کے لئے دھماکے کے بعد دنیا یہ تسلیم نہیں کرتی اور خاص طور پر پاکستان یہ تسلیم نہیں کرتا جو زیادہ اہم ہے کہ پُرامن دھماکہ فوجی دھماکے سے مختلف ہوتا ہے۔

اگر بھٹو ان پابندیوں کے باوجود بھی پلانٹ حاصل کر لیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ پاکستان فوری طور پر تمام غیر ملکی جوہری تکنیک سے محروم ہو جاتا اور اس کا تمام نیوکلیئر پروگرام رک جاتا کیونکہ پاکستان نے ابھی تک خود مکتفی نیوکلیئر تکنیک حاصل نہیں کی ہے اور ابھی کئی برس تک اسے حاصل کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ نہ ہی اس کی معیشت اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ بین الاقوامی ناراضگی برداشت کر سکے۔ ہندوستان نے بھی پوکھاراں دھماکہ کر کے یہ خطرہ مول لیا تھا اور اسے ابھی تک بھگت رہا ہے لیکن جس وقت ہندوستان نے یہ خطرہ مول لیا اس وقت کم از کم اس کی نیوکلیئر اور اس کے ساتھ ساتھ عمومی استعداد اور معاشی قوت اس سے اعلیٰ درجے کی تھی۔

اس لئے جب بھٹو یہ کہتے ہیں کہ وہ ری پروسیسنگ پلانٹ کی مدد سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان نیوکلیئر فرق کو ختم کر دیتے تو اس سے ان کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ایک دھماکے کے ذریعے پوکھاراں دھماکے کی سطح تک پہنچ جاتے مگر پھر بھی ۱۰ سال پیچھے

مسٹر بھٹو اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر صدر سادات اور صدر قذافی کے ساتھ

رہتے لیکن اس کے بعد دونوں ممالک کے درمیان شاید اختلاف اور بھی زیادہ ہو جاتا جتنا کہ آج ہے۔ غیر ملکی امداد کے بغیر کسی مقابلے میں پاکستان پر ہندوستان کی مالی نیوکلیئر اور تکنیکی بالادستی اس وقت سے زیادہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی طرف سے ایک دھماکہ ہندوستان کو اکساتا کہ وہ نیوکلیئر میدان میں اس سے کہیں بڑھ کر کوشش کرے جتنی کوششوں کی طرف اس وقت اس کا رجحان ہے۔

بھٹو کی نیوکلیئر خواہشات کی معقولیت وہ سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے جو ان کے اس الزام میں منڈلا رہا ہے کہ جنرل ضیاء نے اپنی بغاوت کے لئے غیر ملکی حمایت کے بدلے لینے جو ظاہر ہے کہ سازش سے زیادہ باعزت ہوتا۔

پہلی وجہ کی طرف پاکستان اکانومسٹ (۲۱ اکتوبر ۱۹۷۸ء) میں اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس کی تفصیل نہیں دی گئی ہے اس مضمون کا انتہائی موزوں عنوان ہے۔ ری پروسیسنگ ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پاکستان ایٹمی دھماکے کرنے کی استعداد کا خواہاں ہے ہی نہیں۔ وہ دوسری تکنیکوں پر عمل کر سکتا ہے مثلاً پلوٹونیم کی راہ اختیار کر کے اس سے منسلک پابندیوں کو قبول کر کے سر کے بل گرنے کی بجائے یورینیم کی راہ اختیار کی جائے اسی مضمون میں دوسری وجہ کا بھی اظہار کیا گیا ہے اور بڑے پر زور طریقے پر کیا گیا ہے۔

ری پروسیسنگ پلانٹ کو ڈلوا دیا۔ پاکستانی رہنما اپنے عام بیانات میں فرانس پر زور دیئے جا رہے ہیں کہ وہ اس معاہدے پر عمل درآمد کرے۔ اسی طرح فرانس بھی بغاوت کے کئی ماہ بعد تک عوام کے سامنے معاہدے پر قائم رہا اور بھٹو کے اس دعوے کی تردید ہوئی کہ فرانس اس لئے اس معاہدے سے پھر گیا ہے کہ پاکستان میں ان کی جائز حکومت کی جگہ ایک ناجائز حکومت آگئی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ان بیانات کو ان کی ظاہری صورت میں قبول کر لیا جائے۔ اگر فرانس اور پاکستان یہ فیصلہ کر چکے ہوتے کہ پلانٹ کا معاملہ ختم کر دیا جائے تب بھی ان ممالک کے رہنما ایسے ہی بیانات دیتے جبکہ پس پردہ وہ پلانٹ کے مسئلے کو ختم ہو جانے دیتے۔ بھٹو کے الزام کو ثابت شدہ تسلیم نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جنرل ضیاء بھٹو کے وضع کردہ غیر معقول راستے پر نہ چلنے کوئی اور یا دوسری ۲ وجوہات میں سے کسی ایک وجہ کا سہارا

بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے مداخلت کا منصوبہ تیار تھا

سوال کیا گیا ہے کہ آخر کیوں؟ وہ عوام جو پہلے ہی گھاس کھا رہے ہیں، بھوکے ننگے ہیں، آخر انہیں کیا ایسی ضرورت پیش آگئی ہے کہ بم حاصل کیا جائے اور پورے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا جائے۔

تیسری وجہ خالص فوجی ہے اور جنرل ضیاء کے لئے بہت پُرکشش رہی ہوگی۔ سائنسدان نہیں بلکہ ایک فوجی ہونے کی وجہ سے وہ اس بات کو زیادہ پسند کریں گے کہ پاکستان ایسے اسلحہ حاصل کرے جس کو سپاہی جانتے اور سمجھتے ہوں اور جو اقتدار میں سپاہیوں کے رتبے میں اضافے کا سبب بنیں بہ نسبت اسلحہ کے اس نظام کے جو وسائل کی کثیر تعداد کو ایسے اسلحہ کی طرف موڑتا ہے جنہیں صرف سائنسدان استعمال کرتے ہیں اور جس کی وجہ سے سماج میں سائنسدانوں کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔

اس لئے وہ ایک طرف امریکہ کی طرف سے روایتی اسلحہ کی فراہمی کے منقطع ہونے کی قیمت، پلانٹ حاصل کرنے اور دوسری طرف سے ایسے اسلحہ کی فراہمی میں اضافہ کروانے رگینگر نے خاص طور پر جس کا وعدہ کیا تھا، بشرطیکہ پاکستان پلانٹ کا منصوبہ ترک کر دے، کے درمیان وہ روایتی اسلحہ کو ترجیح دیتے۔ یہ ایسے اسلحہ ہیں جو فوری طور پر دستیاب ہیں جبکہ بھرپور نیوکلیئر استعداد ایک دور کا اور غیر یقینی امکان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ رشوت رہی ہو اور اس کو حاصل کرنے کی ایک شرط یہ رہی ہو کہ پی این اے کی انتخابی کوششوں کی اعانت کر کے بھٹو کا تختہ الٹا جائے بشرطیکہ ایسا ہو جائے یا پھر اگر ضروری ہو جائے تو فوجی بغاوت کے ذریعے تختہ الٹا جائے۔ یہ سینیریو جنرل ضیاء کے خلاف الزامات کے واقعات کا ثبوت تو فراہم کرتا ہے لیکن جنرل ضیاء کے محرکات کے بارے میں ان کی رائے کا نہیں لیکن جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ بھٹو کا تختہ الٹ دیا جائے تو دوسرے اقدامات انہیں جیل میں ڈالنا، انہیں توڑ دینا یا پھانسی دینا، اعلانیہ طور پر ایسے اقدامات ہیں جن کو اٹھانے پر مجبور کرنے والی چیز بھٹو کی مسلسل انتخابی مقبولیت ہے

آئندہ کیا ہونے والا ہے؟

لیکن بھٹو جنرل ضیاء سے جو باتیں منسوب کرتے ہیں ان کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں مگر جنرل یقینی طور پر بھٹو کا تختہ الٹنے یا اس کے بعد سے جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے اسے جائز ثابت نہیں کر سکتے۔ پہلے قرطاس ابیض میں بھٹو پر الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی کی تھی لیکن یہ (قرطاس ابیض اسے ثابت کرنے میں) ناکام رہتا ہے۔ بھٹو یہ بات ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے کہ دھاندلی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی وضاحتیں کہ انہوں نے لاڑکانہ پلان پر کیسے دستخط کئے قطعی قائل نہیں کرتیں۔

لیکن بھٹو یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور قرطاس ابیض اسے غلط ثابت کرنے میں ناکام رہتا ہے کہ انہیں فیصلہ کن اکثریت کی حمایت حاصل تھی اور کسی دھاندلی کے بغیر وہ انتخابات جیت سکتے تھے وہ یہ ثابت کرنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں اور قرطاس ابیض پھر اسے غلط ثابت کرنے میں ناکام رہتا ہے کہ جو کچھ بھی دھاندلی ہوئی ہو وہ کسی اعتبار سے نتائج پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔

اس لئے یہ بات واضح ہے کہ جنرل ضیاء نے جو کچھ کیا یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے صدر اور وزیر اعظم کو معزول کیا جسے عوام میں اور قومی اسمبلی میں اکثریتی حمایت حاصل تھی۔ اور دوسری بات کے بارے میں تو کوئی تنازعہ ہی نہیں ہے انتخابات کے بعد جو فسادات ہوئے وہ مسلح طور پر اتنے شدید تھے کہ ایک سپاہی کو یقین دلا دیں کہ ملک کو بچانے کے لئے اس کا مداخلت کرنا ضروری ہے۔ خاص طور پر ایسے سپاہی کے لئے جو کسی نہ کسی طرح مداخلت کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہو۔

لیکن اگر یہ سچ نہ بھی ہو، اور بھٹو اچھی طرح ثابت کرتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ فوج اس گڑبڑ میں فریق تھی جسے اس نے بعد میں مداخلت کا جواز بنا کر پیش کیا۔ صرف اسی حد تک اس مداخلت کو جائز قرار دیا جا سکتا تھا جس حد کا اعلان ابتداء میں جنرل ضیاء نے کیا تھا یہ حد یہ تھی کہ فوج بہت مختصر عرصے تک میدان پر قابض رہے گی اور اس بات کی فکر کئے بغیر کہ اس طرح بھٹو دوبارہ برسر اقتدار آتے ہیں یا نہیں غیر جانبدارانہ انتخابات کرائے گی۔

لیکن جس انداز میں غیر معینہ مدت کے لئے مارشل لاء جاری ہے وہ جنرل ضیاء کی اعلان کردہ نیت کو مخلصانہ ماننے

کو ناممکن بنا دیتا ہے اس سے بھٹو کے ان خدشات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ "مثبت نتائج" حرف اور حرف جن کے حصول کے لئے وہ انتخاب کرانے پر آمادہ ہیں، سے جنرل کی مراد ایسے نتائج ہیں جو بھٹو کو مکمل طور پر خارج کر دیں۔ چونکہ ابھی طویل عرصے تک ایسا نہیں ہو سکے گا اس لئے انتخاب کے جلد ہونے اور طویل عرصے میں منصفانہ انتخابات ہونے کو خارج از امکان قرار دیا جا سکتا ہے۔ مارشل لا حکام ایسے انتخابات نہیں کرائیں گے چاہے یہ پاکستان کے سیاسی مستقبل کو کتنا ہی غیر مستحکم کر دیں۔

جب تک بھٹو زندہ ہے منصفانہ انتخابات سے اس خوف کی وجہ سے گریز کیا جائے گا کہ وہ انہیں جیت لیں گے یا دوسرے لوگ ان کے نام پر جیت لیں گے لیکن ان کی موت کے بعد بھی، اگر وہ پھانسی سے واقع ہوگی، وہ اس خوف سے انتخابات نہیں کرائیں گے کہ کوئی اور ان کے بھوت کے نام پر انتخابات جیت جائے گا۔ اسی طرح وہ یا ان کا بھوت ان کی پارٹی کے اندر حالیہ انحراف کو بے اثر بنا دیں گے چاہے یہ انحراف حقیقی ہو یا اسے باہر سے وجود میں لایا گیا ہو۔

معزول ہونے کے بعد جو دوسرا واقعہ بھٹو کے ساتھ پیش آیا وہ لاہور ہائی کورٹ میں اس الزام پر "مقدمہ" ہے کہ ایک سازش کے تحت جو انہوں نے تیار کی تھی فیڈرل سیکیورٹی فورس کے دو ارکان نے ان کے ایک سیاسی مخالف کو ہلاک کرنے کی کوشش کی اور مخالف کے باپ کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بھٹو نے مقدمے کی منصفانہ کارروائی کے بارے میں کئی کھردری باتیں کہی ہیں۔ اور زیادہ تر احتجاجاً بائیکاٹ کئے رکھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس ضمن میں ان کی کہی ہوئی باتوں پر بھروسہ کیا جائے۔ واقعات ان کے اور ان کے ساتھ ساتھ امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل مسٹر ریمزے کلارک کے حق میں بولتے ہیں۔ مسٹر کلارک نے لاہور کارروائی کے دوران پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ اور بعد میں اپنا جائزہ شائع کیا تھا۔

سب سے پہلے وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ان دو ججوں کو مقدمۂ قتل کی سماعت کرنے والی بنچ سے خارج کیا گیا۔ جنہوں نے کچھ عرصہ قبل ان کی حبس بیجا کی درخواست منظور کی تھی اور دوسری طرف چیف جسٹس نے خود کو اس تنازعے کے باوجود بنچ میں شامل کیا جب بھٹو اقتدار میں تھے اور چیف جسٹس پر دوسرے جج کو فوقیت دی گئی تھی۔

دوئم یہ کہ مقدمے کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا کہ انہوں نے بھٹو کے خلاف الزامات کو "جعلی طور پر ناممکن" بڑے گواہ کی گواہی "مشتبہ بھی سے زیادہ" اور بھٹو کے خلاف چیف جسٹس کے تعصب کو "ان کے ۵۴۴ صفحات کے فیصلے میں جا بجا بکھرا ہوا" پایا۔ اس کے بعد اس بیان پر یقین نہ کرنا مشکل ہے جو بھٹو عدالت میں ان کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں دیتے ہیں بھٹو کا اپنے مخالفین کے ساتھ برتاؤ شاید اس سے بھی زیادہ خراب تھا لیکن یہ ایک ایسی داستان ہے جسے علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

بھٹو کے وکیل یحییٰ بختیار کے بقول جس میں دو سے زیادہ آدمی نہیں بیٹھ سکتے" اس موت کی کوٹھری میں منتظر بھٹو کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے؟ ان کے سامنے جتنے راستے ہیں

حمود الرحمان رپورٹ میں مجرم کون ہے ؟

سب گمبھیر ہیں۔ لیکن سب سے بدتر وہ ہے جو فوجی حکمرانوں کے نکتۂ نظر سے بہترین ہوگا۔ مگر اس کے عملی صورت اختیار کرنے کی کوئی علامات نہیں ہیں۔

صرف ایک چیز ہے جو جنرل ضیاء کو کھونٹی سے اتار سکتی ہے اور وہ ہے بھٹو کا جسمانی اور اخلاقی طور پر ڈھے جانا۔ ایسی صورت میں بھٹو کے پیروؤں کے پاس ویسا لیڈر نہیں رہے گا جیسا کہ ایک صحت مند اور آزاد بھٹو کسی دن ہو سکتا ہے نہ ہی ان کے پاس نقطۂ اتصال دو وجدان باقی رہے گا۔ جو ایک شہید بھٹو بن سکتا ہے تب جنرل اپنی خواہش کے مطابق "مثبت نتائج" کے حامل انتخابات کروا سکتے ہیں یا سرے سے کرواتے ہی نہیں کیونکہ اگر باقی رہ جانے والا بھٹو ایک ساتھ کھویا ہوا رہنما ہو تو ان پر دباؤ بہت ہی کم ہو جائے گا پی این اے سمیت کئی جماعتیں انتخابات کا مطالبہ کر رہی ہیں لیکن اگر بھٹو سمیت پی پی پی کی ساکھ چھن جائے تو فوج کا سیاسی معاملات نمٹانے کا کام بہت آسان ہو جائے گا

اپنے حالات کے بارے میں بھٹو کا بیان دردناک ہے اور یہ شاید کئی ماہ قبل لکھے گئے تھے اور اس کے بعد سے ان کی بھوک ہڑتالوں کی خبریں بھی آتی رہی ہیں اس لئے ہو سکتا ہے آج ان کی حالت پہلے سے بھی خراب ہو اور بیرونی طاقتوں اور ملکی لیڈروں کی طرف سے فوری ردعمل کی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت مند ہوں لیکن اگر ماضی کوئی رہنمائی کر سکتا ہے تو بھٹو ایک مضبوط اور اعلیٰ محرکات رکھنے والے آدمی ہیں جنہیں ...... سے مزید تقویت ملتی ہے ایسے سیاستدان جب لڑائی میں گھر جائیں تو کافی دیر پا ثابت ہوتے ہیں۔

بھٹو کی دوہری اپیلیں یہ امکانات پیش کرتی ہیں کہ زیتون کی وہ شاخ جو وہ بیرونی طاقتوں کے لئے اٹھائے ہیں وہ ان کے ماضی کے اعتقادات کے سخت کانٹوں سے بھری ہوئی ہیں اور ملکی لیڈروں سے "جماعتوں کے درمیان مذاکرات" کی اپیل کرتے ہوئے وہ اب بھی "مارشل لاء کے عذاب اور بدنما داغ" کی مذمت کرتے ہیں اس پورے بیان میں ایسی دوسری عبارتیں بھی ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ ان کا دانشورانہ ریاضی ذہن کی تیزی اب بھی اتنے ہی عظیم ہیں جتنے پہلے تھے بلکہ شاید اب پہلے سے بھی زیادہ ہیں۔

بھٹو کے ڈھے جانے کا انتظار کرتے ہوئے جنرل ضیاء کو ایشیا کے دوسرے کنارے پر ایک اور مطلق العنان صدر اور ایک اور قیدی کے معاملے پر بھی غور کرنا چاہئیے فلپائن میں صدر مارکوس اکینو کو توڑنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ جنہیں انہوں نے سازش اور قتل کے الزام میں جیل میں ڈال رکھا ہے۔ اکینو کو مقابلہ کرتے ہوئے، سال تو گزر ہی چکے ہیں۔

اگر بھٹو ڈھے نہیں جاتے تو پھر ان پر کیا گزرنے والی ہے؟ جیسے حالات ہیں آیا یہ ایسے ہی رہیں گے ایسا نکتہ ہے جس پر بعد میں بحث کرنے کی ضرورت ہے ظاہری امکانات ۲ باتوں تک محدود ہیں۔ پھانسی کے ذریعے جلد آزادی اور عذاب کی طویل رات جس میں پہلے امکان کے حق میں پلڑہ بھاری ہو۔ بھٹو کے خلاف اور دوسرے مقدموں کی لمبی ڈور بندھی ہے جس میں قتل کا ایک اور الزام اور انتخابات میں دھاندلی کا الزام بھی شامل ہیں ان مقدمات میں ان کے خلاف کارروائی کے بارے میں توقع ہے کہ اتنی ہی منصفانہ ہوگی جتنی کہ لاہور ہائیکورٹ کی کارروائی تھی لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس ہی چیف الیکشن کمشنر بھی

بھٹو تین حریفوں کی سازش کا شکار بنے

ہیں لا ایک ایسا اجتماع جس کے خلاف مسٹر بھٹو نے لا حاصل احتجاج کیا تھا) اور بلا شبہ دھاندلی کو ثابت کرنے کے لئے بہت کچھ کریگے۔

اس لئے ایک طرف موجودہ مقدمۂ قتل میں بھٹو کے بری ہونے کے مواقع کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا سپریم کورٹ اس بات کو مناسب سمجھتی ہے کہ پورے معاملے کا از سرِ نو جائزہ اور آزادی کے ساتھ لے اور خود کو حرف قانون کے سوال تک محدود نہ رکھے۔ بہر حال یہاں کچھ زیادہ قانون کا سوال در پیش نہیں ہے اگر آدمی نے قتل کیا ہے تو پھانسی چڑھے گا اصل سوال یہ ہے کہ اشتراک کے حقائق کیا ہیں آیا لاہور ہائیکورٹ نے ایک غیر جانبدار ذہن کے ساتھ حقائق کا مطالعہ کیا ہے دوسری طرف اس مقدمے میں ان کے ناقابل قیاس برأت کی صورت میں وہ دوسرے مقدمات میں سلاخوں کے پیچھے رکھے جائینگے۔

اگر سپریم کورٹ سزائے موت کی توثیق کر دیتی ہے اور بھٹو رحم کی درخواست نہیں کرتے تو ایسی کوئی بات نہیں جو جنرل ضیاء کو خود اپنی طرف رحم کرکے سزائے موت میں تخفیف کرکے اسے عمر قید میں تبدیل کر دیں ایسا کیا جائے یا نہ کیا جائے اس کا فیصلہ کرتے وقت انہیں دوسرے ممالک کے رد عمل کو سامنے رکھنا ہوگا مگر بھٹو کی بدقسمتی سے سفارتی دباؤ دو طرفہ کام کرے گا۔

لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے کے بعد کتنی ممالک نے جنرل ضیاء پر زور دیا ہے کہ سزا پر عملدرآمد نہ کریں ہندوستان نے موافقانہ خاموشی اختیار کی اور ہو سکتا ہے کہ اب بھی یہی کرے لیکن چین امریکہ سوویت یونین ایران سعودی عرب مصر، لیبیا اور کئی دوسرے ممالک نے رحم کرنے کا مشورہ دیا سوویت یونین اور آگے گیا کنارے بیٹھنے کی بجائے اس نازک صورتحال میں چھلانگ لگا دی اور بھٹو کو ترقی پسند اور ان کے جانشینوں کو رجعت پسند قرار دیا (ماسکو کے لئے اپنی سرمایہ کاری پر ڈیویڈنڈ وصول کرنے کا دن آ سکتا ہے)

لیکن لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے کے بعد ایران کے واقعات نے بھٹو کے خلاف مداخلت کی ہے اول تو یہ کہ جیسا کہ پہلے بحث کی جا چکی ہے ان واقعات نے جنرل ضیاء کے لئے خط کشید کیا کہ بھٹو جب تک زندہ ہیں کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں دوم یہ کہ ان واقعات نے شاہ کو ہٹا دیا ہے جن کا مشورہ پاکستان میں زیادہ طاقتور ہوتا۔ سوئم یہ کہ ان واقعات نے سعودی عرب کو کوئی ایسا مشورہ دینے کے بارے میں پس و پیش میں ڈال دیا ہے جو صدر ضیاء کے لئے ناخوشگوار ہو ایک بازو پر ایک برادر تاجدار کو کھو دینے کے بعد سعودی عرب دوسرے بازو میں ایک مطلق العنان برادر کو پریشان کرنا پسند نہیں کرے گا اس لئے جنرل شاید خود کو آزاد محسوس کریں کہ اپنی ترجیحات کے مطابق اپنی راہ عمل کا تعین کریں اور ان ترجیحات کی رہنمائی اس قدر و قیمت سے ہوگی جو وہ اپنی گردن سے وابستہ کرتے ہیں۔

ان دونوں (یعنی جلد پھانسی یا غیر معینہ قید میں سے کسی صورت میں بھی نتائج پاکستان کے لئے زیادہ اہم ہیں یہاں صرف قیاس آرائیوں پر انحصار کیا جا سکتا ہے اور میں ان ہی امکانات کی چہار دیواری میں قیاس آرائی کروں گا پہلا یہ کہ اگر مسٹر بھٹو کو پھانسی دی گئی تو عوامی غصہ پھٹ پڑیگا دوسرا یہ کہ جنرل ضیاء کسی حد تک خون خرابے کے بعد اس دھماکے پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے گو کہ اس خون خرابے کی وسعت کے بارے میں بیرونی دنیا کو کچھ معلوم نہ ہوگا۔ تیسرا یہ کہ اس احتجاج کو کچلنے میں کامیاب ہونے کے بعد جنرل ضیاء کی حکومت زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہے گی

اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر مسٹر بھٹو شیخ زید کے ساتھ

چوتھا یہ کہ جب جنرل ضیاء رخصت ہو جائیں گے تو بھٹو کا بھوت ان کی جگہ لے گا یا خود بھٹو کو عمر قید ہونے کے لبعد بھی یہ باتیں وقوع پذیر ہوئی ہوں یا وہ ایسی تیز رفتاری سے واقع ہوئی ہیں ابھی کا امکان نہیں ہے کہ بھٹو کو پھانسی دینے سے پہلے ہی جنرل ضیاء کو ہٹا دیا جاتا ہے جب واقعات کا یہ دائرہ مکمل ہو جائے گا تو پاکستان ایک انتہائی مختلف محور میں داخل ہو گا۔ اسی کی وجہ لبعد میں آنے والی حکومت یا حکومتیں ہوں یا ان کی خواہش کے لبغیر ہی ہو۔

ان محدود قیاس آرائیوں کو پھیلانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے بھٹو نے پیشگوئی کی ہے کہ "اگر مجھے پھانسی کے ذریعے قتل کیا گیا تو "آگ لگ جائے گی" "زبردست آگ لگے گی مگر ایسی نہیں کہ اس پر قابو نہ پایا جا سکے۔ یہ کہنے کی دو وجوہات ہیں پہلی وجہ یہ کہ اپنی صدارت کے آخری دنوں میں بھٹو نے اپنے اقتدار کو ایسی طمع اور غرور کے ساتھ استعمال کیا کہ اس نے عوام کی بڑی تعداد وادر اقدام کر سکنے والے ایسے اداروں کو ان سے کاٹ دیا جو دوسری صورت میں جنرل ضیاء کی مخالفت کو مستحکم کرتے، انہی کی طرف سے بھٹو کی مخالفت تھی جس نے جنرل ضیاء کو بھٹو کے خلاف کارروائی کرنے کی جرأت دلائی اور یہ انہی کی حمایت ہو گی جو جنرل ضیاء کو اس قابل بنائے گی کہ وہ آگ کو قابو سے باہر ہونے سے پہلے ہی اس پر قابو پا لیں۔

دوسری وجہ یہ ہے پاکستان میں علاقائی سیاسی مفادات کی مختلف النوعی کچھ آگ کو پھیلائے گی۔ تمام مفادات کسی نہ کسی حد تک اس آگ میں کوئلے ڈالیں گے لیکن اس کے لبعد ہر ایک اپنی راہ کی طرف کھینچے گا اور اس سے جنرل ضیاء کو مدد ملے گی۔

لیکن یہ صرف مختصر عرصہ کے لئے ہو گا طویل مدت میں برصغیر کی سیاسی فطرت جس کی تعریف میں بھٹو نے ایک سیاسی نغمہ لکھا ہے پاکستان میں بھی اپنا رنگ دکھائے گی اس عمل اسے حسبِ ذیل حقائق سے مدد ملے گی۔

(۱) پاکستان کی فوج بڑی حد تک پنجابی فوج ہے یہ غیر پنجابی صوبوں میں گڑبڑ کو دبانے کے لئے جس قدر سخت اقدامات کرے گی یہ انہیں طویل مدت میں اتنا ہی مشتعل کرے گی۔

(۱۱) ایران کے وجدان نے پورے خطے کو اور احتجاج کے نو عمر مرحلوں کو جس کی پاکستان میں کوئی پوشیدہ نہیں ہیں اتنا جرأتمند بنا دیا ہے کہ اگر وہ ایک بار آگ پکڑ لیں تو انہیں دبانا خصوصاً مشکل ہو گیا ہے۔

(۱۱۱) فوج میں نوجوان افسروں کی خاصی تعداد پر مشتمل گروہ موجود ہے جو جنرل ضیاء کے مقابلے میں بھٹو کو زیادہ قابلِ تقلید سمجھتے ہیں ان کی انتہا پسندی انہیں صدر ضیاء کے مقابلے بھٹو کی طرف زیادہ لے جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہو گا کہ پہلے بے چینی ہو گی پھر جنرل ضیاء کی حکومت کو بدلا جائے گا ممکن ہے کہ پہلے سینئر جنرلوں کا گروپ ان کی جگہ لے اور یہ طے کرے کہ بھٹو سے نمٹنے کے لبعد ضیاء کی افادیت ختم ہو گئی ہے لیکن لبعد میں نوجوان افسروں کا کوئی گروہ یا سیاسی جماعتوں کا رنگ برنگ جمگھٹا ان کی جگہ لے گا اگر بھٹو اس وقت بھی زندہ ہوں جب یہ تبدیلیاں واقع ہو رہی ہوں لیعنی اگر بھٹو کو عمر قید ہونے کے خلاف بھی احتجاج ہوتا ہے یا سزائے موت کی توثیق لیکن اس پر عملدر آمد سے پہلے ہوں تب وہ زیادہ عرصے اقتدار سے باہر نہیں رہیں گے۔

اگر وہ اس وقت مر چکے ہوں تو یکے لبعد دیگرے ہونے

ہندوستان آمریتوں کا عذاب سہتا تو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا؟

والی تبدیلیاں پاکستان کو تبدریج اسی قسم کی سیاست کی طرف لے جائیں گی جو لبعض تشدت پسند عرب ممالک میں فروغ پا رہی ہے اس قسم کی سیاست جس کی بھٹو نے اس بیان میں جسے ان کی وصیت کا نام دیا جا سکتا ہے نشاندہی کی ہے لیکن یہ بات مشتبہ ہے کہ پاکستان بیک جست عراقی، شامی، لیبیائی محور میں چلا جائے گا۔ ممکن ہے کہ اس ضمن میں بھٹو کے خدشات درست ثابت ہوں جبکہ انہیں غلط ثابت کرنے کے لیے وہ خود موجود نہ ہوں۔

لیکن ایک سوال ہے جو تمام قیاس آرائیوں کے مقابلے پر کھڑا ہے بھٹو نے آخر اس سب کو کیوں بھک سے اڑا دیا جبکہ ان کے پاس سب کچھ تھا۔؟ ان کے پاس اقتدار تھا، مقبولیت تھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فہم و فراست تھی کہ ان چیزوں کے ساتھ انہیں کیا کرنا چاہیئے ان کے پاس روشن خیال تربیت تھی جو انہیں یہ فیصلہ کرنے میں مدد دیتی کہ ان کی ترجیحات کیا ہونی چاہئیں تب انہوں نے اپنے کیریئر (ان کی زندگی؟) کے اختتام کے قریب ایسا رویہ کیوں اختیار کیا جیسا رویہ ایک محصور قبائلی سردار غصے کے عالم میں اختیار کرتا ہے اس مہذب رہنما کے رویے جیسا نہیں جو ایک روشن مستقبل رکھنے والے ملک کا رہنما ہو جبکہ اس کے افق پر کوئی بادل نہ ہوں سوائے ان چند بادلوں کے جو خود اس کے اپنے پیدا کردہ ہوں۔

اگر بھٹو ان لوگوں کی وفاداریوں کو بچائے رکھ سکتے جنہوں نے ان کی خوب خدمت کی تھی اور طاقت کے ہر اس آلے کو جو ان کی دسترس میں آیا نہ توڑتے مروڑتے تو کوئی جاہ پرست جنرل انہیں نکال پھینکنے کی جرأت نہ کر سکتا کیونکہ مارشل لاء کے کینسر کا ایک تریاق ان کے پاس تھا اور وہ تھا عوام کی حمایت لیکن انہوں نے جو رویہ اختیار کیا اس کے لبعد وہ بے اعتمادی کا نشانہ بن گئے انسان موت کی کوٹھری سے حالات کا کم حیلوں بہانوں سے جائزہ لیتا ہے مگر ان کی وصیت بھی ... گو کہ یہ انتہائی درخشاں ہے اور شاید مخلصانہ بھی، وہ بھی کسی قدر تمسخر کا نشانہ بنے۔

اگر اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دوسرے ممالک میں دوسرے رہنماؤں نے بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا تھا اور اس نے بڑے مواقع کو ضائع کر دیا تھا تو اس سے یہ سوال اور بھی شدید ہو جاتا ہے تیسری دنیا کے اتنے بہت سے جمہوریت پسند رہنماؤں نے ان موقعوں کو ضائع کر دیا جو انہیں اپنی زندگی میں ادارے تعمیر کرنے کے لئے حاصل تھے اس کی بجائے انہوں نے ان موقعوں کو خود اپنی طاقت کی آگ میں جلا دیا؟ نہرو ایک استثنیٰ کے طور پر نمایاں ہیں لیکن وہ اتنے نایاب کیوں ہیں۔

لیکن اس تعارف کا مقصد فلسفیانہ سوالات اٹھانا نہیں ہے اس سے بھی کم ان کا جواب دینا، مقصد صرف یہ ہے کہ ان دلائل کو یکجا کر دیا جائے جو بھٹو کی دستاویز میں بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے ذریعے قاری کی رہنمائی کی جائے اس فرض کی انجام دہی کے لبعد تعارف کو ختم ہو جانا چاہیئے اس کے لبعد جو کچھ ہے وہ "غذا" ہے جس کا بھٹو نے وعدہ کیا تھا۔

***

اسلام آباد

ذوالفقار حیدری

بیگم راؤ رشید اور بشارت ملک کے ساتھ سلوک خفیہ منصوبے کا حصّہ ہیں

یومِ پاکستان کا سرکاری پروگرام

جماعتِ اسلامی

کی نذر ہو گیا

***

مارشل لا حکومت میں شامل مسلم لیگ کے پانچ وزرا نے اس سال کے شروع میں ٹی وی پر اپنی نوعیت کی انوکھی پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ اس بار یومِ پاکستان کی تقریبات وسیع پیمانے پر اس طرح منائی جائیں گی کہ اس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ہو گی۔ اس روز تحریکِ پاکستان کے کارکنوں کا اجلاس ہو گا پھر جلوس نکالا جائے گا جس کی قیادت صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاالحق کریں گے۔ یومِ پاکستان کو پہلی بار شایانِ شان منانے کے لئے صدرِ مملکت کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ یہ سارے پروگرام ہوائی قلعہ ثابت ہوئے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تحریکِ پاکستان میں حصّہ لینے والے تمام ہی کارکن اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں یا انہوں نے یومِ پاکستان منانے سے معذوری ظاہر کر دی ہے بلکہ ہوا یوں کہ جماعتِ اسلامی نے اس تمام پروگرام کا بڑا بُرا منایا۔ اپنے مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بانیٔ جماعتِ اسلامی نے صدر جنرل محمد ضیاالحق سے کہا کہ اگر تحریکِ پاکستان کے کارکنوں کے نام پر یہ سارا کاروبار شروع ہوا تو جماعتِ اسلامی بڑی مشکل میں پھنس جائے گی ہم کس طرح ان تقریبات میں شرکت کر سکیں گے کہ ہم تو تحریکِ پاکستان کے کارکن نہیں ہیں اور اگر ہم نے اس کنونشن اور ان تقریبات میں شرکت نہ کی تو اس ملک کے عوام ہمیں ہرگز ہرگز معاف نہیں کریں گے۔ یہ ایک ایسی دلیل تھی جو جنرل صاحب کے دل کو لگی وہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ جماعتِ اسلامی کی پوزیشن خراب ہو، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی بات تھی چنانچہ سارے پروگرام کو مسترد کر دیا گیا۔ یومِ پاکستان کو شایانِ شان طریقہ پر منانے کی تجویز اور پروگرام سب ختم کر دیا گیا۔ آخری وقت میں پنجاب حکومت نے اعلان کیا کہ جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لیجئے اب تو باقاعدہ جواز بھی فراہم ہو گیا۔ پاکستان اور اسلام کے نام پر کاروبار چلانے والے لوگوں کی پاکستان سے محبت آشکار ہو گئی ہے۔ کیا یہی پاکستان سے محبت ہے کیا لوگوں کو اسی طرح بے وقوف بنایا جاتا رہے گا۔ کیا جماعتِ اسلامی اسی طرح پیرِ تسمہ پا بنی رہے گی کیا اب قومی تقریبات بھی جماعتِ اسلامی کی مرضی سے منائی جایا کریں گی، ان سوالات کا جواب ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ نہ وہ لوگ جنہیں صرف کرسیاں اور اقتدار پیارا ہے اور نہ وہ جو خود اصل حکمران ہیں کہ وہ اس کا کوئی جواز فراہم نہیں کر سکتے۔

جنرل محمد ضیاالحق نے کہا ہے کہ وہ پیپلز پارٹی اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں اس کا اظہار سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد ہی کریں گے۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ ہفتے کو ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ جنرل صاحب پیپلز پارٹی کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں، ہم آپ کو یہ فیصلہ بتاتے ہیں جنرل صاحب کی پیپلز پارٹی سے نفرت اب کھلی بات ہے۔ انہوں نے اور دوسرے افراد نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر مسٹر بھٹو کو زندہ رکھنا ہے تو ان کی جماعت پر تو بہرحال پابندی لگا دی جائے تاکہ عام انتخابات کے نام پر جو ڈرامہ رچایا جانے والا ہے اس میں صرف اسی صورت میں مثبت نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں ورنہ اور دوسری کوئی صورت نہیں ہے ایک صورت یہ بھی تھی کہ تمام سیاسی جماعتوں میں پھوٹ ڈالی جائے اور یہ جماعتیں انتخابات میں حصّہ لیں بھی تو اس کے نتائج ایسے ہی نکلیں۔ چنانچہ منصوبے کے پہلے مرحلے کے تحت مسلم لیگ میں پھوٹ ڈالی گئی۔ اس سے پہلے ہمارے دوست کوثر نیازی سے ایک علیحدہ گروپ پیپلز پارٹی کا بنوا دیا گیا۔ اب این ڈی پی کی باری ہے اور اس میں پھوٹ کے آثار اس قدر نمایاں ہو گئے ہیں کہ اخبارات میں اختلاف ظاہر ہونے لگے ہیں۔ جمعیت علمائے پاکستان میں بھی پھوٹ ہے اور اسے ہوا دی جا رہی ہے۔ جمعیت علمائے اسلام کوئی جماعت ہے ہی نہیں صرف لے دے کر جماعت اسلامی باقی رہ جائے گی اور مثبت نتائج کے نام پر صرف جماعت اسلامی ہی انتخاب جیتے گی اور یہ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلی بدقسمتی ہو گی کہ ۳۱ سال میں جماعت اسلامی دو اور چار نشستوں کی بجائے اکثریتی نشستیں جیت لے گی۔ اس صورتِ حال پر جنرل صاحب کے خیالات بڑے واضح ہیں۔ انہوں نے ایک امریکی خبر رساں ادارے سے انٹرویو کے دوران کہا کہ اگر ان انتخابات کے نتائج میں ایک سال بھی حکومت بنی رہے تو یہ کامیابی ہو گی کیونکہ اس کے بعد پھر جو حکومت عام انتخابات کے نتیجے میں بنے گی وہ مضبوط ہو گی اور کم از کم پانچ سال چلے گی۔ گویا جنرل صاحب کو اپنے ڈرامے کے ایک سال کے اندر فیل ہو جانے کا یقین ہے۔ کاش وہ یہ تجربہ کرنے کی بجائے عام انتخابات کرائیں اور اقتدار منتخب نمائندوں کو دے دیں، خواہ پیپلز پارٹی ہی اقتدار میں کیوں نہ

آجائے کہ عوام کی رائے کے خلاف کوئی بند نہیں باندھا جاسکتا یہ گارنٹی بیگم نصرت بھٹو نے بھی فراہم کر دی ہے کہ کسی سے بھی انتقام نہیں لیا جائے گا اور اس طرح تو ہرگز نہیں کیا جائے گا جیسے کہ آج بھی کیا جا رہا ہے

صدرِ مملکت چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور چیف آف دی آرمی اسٹاف جنرل محمد ضیاالحق نے کہا ہے، کہ پیپلز پارٹی کے دہریے اور کمیونسٹ عناصر ملک کو جدید ترین راستے پر ڈالنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں صدرِ مملکت کا یہ بیان ایک انٹرویو کی صورت میں سعودی عرب کے ایک اخبار میں اور وہاں سے بھارت کی جماعت اسلامی کے سہ روزہ دعوت میں شائع ہوا ہے جسے پاکستانی اخبارات میں بطورِ خاص شائع کر دیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی اس کی قیادت اور دوسرے ترقی پسندوں سے جنرل ضیاالحق کی نفرت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اب تو بلی تھیلے سے باہر نکل ہی آئی ہے۔ جنرل صاحب کے ان خیالات پر جماعت اسلامی کی زبردست چھاپ ہے جماعت اسلامی نے ترقی پسندوں کے ساتھ جو سلوک شروع کیا ہے وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ جماعتیوں نے ترقی پسندوں سے اکیلے اکیلے نبٹنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے پر عمل درآمد شروع بھی کر دیا ہے! الوپیا کی راولپنڈی برانچ کے صدر مسٹر بشارت ملک جنرل سیکریٹری رفیق بٹ پر جماعت اسلامی کی پی آئی اے میں ذیلی تنظیم پیاسی کے کارکنوں نے حملہ کیا اور پیاسی کے دس سے بارہ ارکان نے انہیں خوب زدوکوب کیا اور انہیں دفتر سے باہر لے گئے اور چاقوؤں سے حملہ کیا۔ یہ حملہ آور چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ اب بھی اپنے خیالات سے باز آؤ گے یا نہیں۔

یہ واقعہ ایئرپورٹ پر صبح کو ہوا۔ سہ پہر کو پیپلز پارٹی کے ایک رہنما مسٹر راؤ رشید جو آج کل اٹک جیل میں نظربند ہیں۔ ان کی اہلیہ بیگم نسرین رشید اور ان کے پندرہ سالہ بیٹے کو جماعتیوں نے راولپنڈی شہر کی پُررونق شاہراہ پر زدوکوب کیا اور ان کے ساتھ بدتمیزی کی۔ ہوا یوں کہ بیگم نسرین رشید اپنے بیٹے کے ہمراہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے واپس آرہی تھیں جہاں وہ اس لئے گئی تھیں کہ راؤ رشید سے ملنے جائیں تو اپنے بیٹے کو بھی ہمراہ لیتی جائیں۔ وہ اپنی کار آر آئی ای ۳۱ میں جب صدر سے شاہراہ پہلوی پر مڑیں تو پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی ایک ویگن آر آئی ۸ ۵۳۵ ان کی کار کا پیچھا کرنے لگی آٹھ آدمی سوار تھے۔ انہوں نے مسز نسرین رشید کی کار کو کئی جگہ خطرناک طریقہ سے اوورٹیک کیا اور بدتمیزی سے شور مچایا۔ کمیٹی چوک کے قریب سگنل کی روشنی سرخ تھی، مسز رشید کی کار رک گئی تو پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی ویگن بڑی تیزی سے ان کے بائیں جانب سے آگے بڑھی۔ اس ویگن نے اچانک داہنی جانب کو اپنا سٹیرنگ اس طرح موڑا کہ مسز رشید کی گاڑی کو زبردست دھکا لگا، مسز رشید کا منہ بڑی زور سے کار کے سٹیرنگ میں جا کر لگا اور ان کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ نیم بے ہوش ہو گئیں۔ پی بی سی کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے مسز رشید کی گاڑی کا دروازہ کھول کر راؤ رشید کے بیٹے کو باہر کھینچ لیا اور اس کے کئی تھپڑ رسید کر دیئے انہوں نے کہا کہ یہ لڑکا گاڑی چلا رہا تھا جب لڑکے نے پوچھنے پر بتایا کہ وہ راؤ رشید کا بیٹا ہے تو کئی لوگ وہاں جمع ہو گئے انہوں نے زور زور سے چلا کر کہا۔ ان سرخوں کو خوب مارو، ان کی ایسی تیسی کر دو۔ گاڑی میں سوار لوگوں اور دوسرے افراد نے اس کے باوجود کہ ایک خاتون زخمی ہو گئی تھیں۔ ان کے ساتھ بدتمیزی کی۔ اسلامی تہذیب کے علمبردار اپنی بدترین تہذیب کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مسز رشید کا خون بہتا رہا وہ اپنی نشست پر نیم بے ہوش پڑی تھیں اور لوگ ان کے بیٹے کو مار پیٹ رہے تھے۔ ہجوم بڑھتا گیا کہ پولیس کے سپاہی نے موقعہ پر پہنچ کر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ شروع کیا۔ مسز رشید کو چوک میں موجود پولیس پوسٹ میں لے جایا گیا۔ کچھ لوگ اس صورتحال پر کڑھ رہے تھے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ صورتحال بگڑنے کا خدشہ تھا۔ ریڈیو پاکستان کی گاڑی کے سوار ڈرائیور سے کہہ رہے تھے کہ تم کہنا لڑکا گاڑی چلا رہا تھا۔ ڈرائیور نے ان کی بات نہیں مانی اور بیگم نسرین رشید سے ہاتھ جوڑ کر کہا اسے معاف کر دیا جائے اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور وہ بے روزگار ہو جائے گا۔ مسز رشید نے اسے معاف کر دیا۔

بعد میں اس ڈرائیور نے بتایا کہ وہ جب گاڑی لے کر چلا تو اس گاڑی میں سوار ریڈیو کے ایک ملازم بھٹی نے اسے کہا کہ مسز رشید کی گاڑی آگے جا رہی ہے اس لئے اس سے آگے نکالو۔ جب اس نے گاڑی آگے نکالی تو گاڑی میں سوار لوگوں نے بدتمیزی سے نعرے لگائے اور جب مسز رشید کی گاڑی کمیٹی چوک پر کھڑی تھی اور اس نے اپنی گاڑی ان کے برابر سے نکالی تو ساتھ بیٹھے ایک شخص نے اچانک اس کی گاڑی کا سٹیرنگ زور سے دائیں جانب اس طرح موڑا کہ اس کی گاڑی مسز رشید کی گاڑی سے ایک دھماکہ سے ٹکرا گئی اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مسز رشید نے موقعہ پر موجود پولیس کانسٹیبل اور اے ایس آئی کی یہ بات نہیں مانی کہ وہ ڈرائیور سے تصفیہ کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا میں ڈرائیور کو معاف کر رہی ہوں۔ اگر مجھے انصاف ملنے کی توقع ہوتی تو میں ضرور رپورٹ درج کراتی۔ مگر مجھے انصاف کی توقع نہیں ہے اس لئے یہ فضول ہے۔ انہوں نے کہا جو لوگ صرف پیپلز پارٹی کی وجہ سے ہمیں مطعون بنا رہے ہیں اور اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان میں سے کسی کو صدارتی عہدہ نہیں ملے گا۔ اوپر بیٹھے ہوئے لوگ عوام کو آپس میں لڑا کر جو پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں اس سے ملک کا نقصان ہوگا انہیں ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیئے۔

جنرل ضیاالحق صاحب کے بیٹے کی شادی بلوچستان کے گورنر کی بیٹی سے ملتان میں ہوئی۔ اخبارات نے خبریں چھاپیں کہ جنرل صاحب نے عام آدمیوں کی طرح خیبر میل میں سفر کیا۔ ان کے لئے خاص بوگی نہیں لگائی گئی حقیقت یہ ہے کہ جنرل ضیاالحق صاحب نے اس بوگی میں سفر کیا جو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے بطورِ خاص بنوائی تھی، جنرل صاحب نے اس بوگی کو بڑا پسند کیا۔ عام آدمی کی طرح سفر کرنے والے صدرِ مملکت کی گاڑی کے ساتھ تین خاص بوگیاں بھی لگائی گئی تھیں۔ خیبر میل راولپنڈی کے سٹیشن پر پشاور سے پہنچی تو اسٹیشن عام مسافروں سے خالی کر دیا گیا۔ اور کراچی سے آنے والی خیبر میل کو صبح چار بجے راولپنڈی پہنچنے دیا گیا کہ اس وقت جنرل صاحب کو لے کر جانے والی خیبر میل پنڈی کے علاقے میں تھی یہ احمقانہ خبر بھی چھپی کہ جنرل صاحب کے ملتان پہنچنے کی خبر اعلیٰ سرکاری حکام کو بھی نہ تھی۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ اعلیٰ سرکاری افسروں کی نالائقی اور نااہلی ہے کہ انہیں صدر کی کسی شہر میں آمد کا پتہ بھی نہ چلے حالانکہ صدر چوری چوری ملتان نہیں گئے تھے اور اگر یہ خبر غلط ہے تو اس کے چھپوانے سے سستی شہرت حاصل کرنا مقصود ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ خبر جنرل صاحب نے ہرگز اخبارات میں چھپنے کے لئے نہ دی ہوگی بلکہ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں نے اپنی کارگزاری دکھائی ہے۔

*

ایسی دہشت گردی کا زمانہ کبھی نہیں آیا تھا

جسارت کا تیر ملازمتوں پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگا رہا ہے

خصوصی رپورٹ

جماعت اسلامی کے وزیر اطلاعات محمود اعظم فاروقی کی ہدایت پر ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ابلاغ عامہ کے دیگر اداروں سے ترقی پسند، آزاد اور روشن خیال کارکنوں کی تطہیر کا "کارِ خیر" شروع ہو گیا ہے۔ اس سے قبل بھی ریڈیو اور ٹی وی کے متعدد باصلاحیت پروڈیوسروں اور کارکنوں کے گلے پر تنزلی، تبادلے اور معطلی کی تیز چھری چل چکی ہے ابلاغِ عامہ کے اداروں پر خوف و ہراس کی فضا طاری ہے ہر شخص اپنے روزگار کے چھن جانے اور بیروزگاری کے اندیشوں میں مبتلا ہے۔ ایوب اور یحییٰ خان کے زمانے میں بھی یہ صورتحال پیدا ہوئی تھی، مگر اس میں اتنی شدت، سنگینی اور چبھن نہ تھی جتنی آج محسوس کی جا رہی ہے۔

کارکنوں کو روزگار سے فارغ کرنے کی تازہ ترین مہم ایک بار پھر ریڈیو سے شروع ہوئی ہے۔ سینئر پروڈیوسر سید عرفان علی اور عسکر مہدی کی تنزلی کر کے پروڈیوسر بنا دیا گیا۔ عرفان علی سترہ برس سے ریڈیو سے وابستہ ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کا عہدہ ہی نہیں گھٹایا گیا، بلکہ ان کا تبادلہ بہاولپور کیا جا رہا ہے۔ سید عسکر مہدی کا بھی جو اپنی صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر براہِ راست سینئر پروڈیوسر مقرر ہوئے تھے، عہدہ گھٹا کر ان کی خدمات کا "اعتراف" کیا گیا ہے۔ واضح رہے ان دونوں سینئر پروڈیوسروں پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ انہوں نے ۵ جنوری کو فلم زندگی کا ایک گانا "سالگرہ کا دن آیا ہے" نشر کیا تھا۔ ۱۰ جنوری کو جماعت اسلامی کے ترجمان اخبار جسارت میں ان کے خلاف خبر شائع کرائی گئی کہ انہوں نے ۵ جنوری کو جو پیپلز پارٹی کے معتوب چیئرمین جناب بھٹو کی سالگرہ کا دن تھا، جان بوجھ کر یہ گانا نشر کیا اس خبر کی اشاعت کے فوراً بعد ان کو معطل کر کے چارج شیٹ دی گئی۔ ان کے خلاف جو انکوائری کمیٹی مقرر کی گئی اس میں جماعت کے حامیوں کو شامل کیا گیا جس کے نتیجے میں گزشتہ دنوں کوئی واضح شہادت اور الزام ثابت کئے بغیر ان کا عہدہ گھٹا کر انتقام کی آگ بجھائی گئی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ریڈیو، ٹی وی اور ابلاغ کے دیگر اداروں میں کام کرنے والے ترقی پسند اور روشن خیال کارکنوں کے بارے میں جماعت کے اخبار جسارت میں بے بنیاد اور گھٹیا پروپیگنڈے کی مہم شروع کی گئی ہے جس کی روشنی میں ان کارکنوں کو انتقام کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ نشریاتی اداروں کے بعض ملازمین کا کہنا ہے کہ صبح اٹھ کر ان کا سب سے پہلا کام جسارت دیکھ کر یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ ان کی نوکری سلامت ہے یا ختم ہو گئی۔ ایسی دہشت گردی کا زمانہ کبھی نہیں آیا تھا۔

ایکسٹرنل سروس میں سید حسین کاظمی کو جو گزشتہ کئی برس سے فارسی سروس کے انچارج تھے، ہٹا دیا گیا ہے اور ان کی جگہ مس فاروق جہاں تیموری کو مقرر کیا گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ وہ فارسی بالکل نہیں جانتیں اسی طرح نجمہ نقوی اور حسن بلگرامی سے بھی ان کے پروگرام واپس لے لئے گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کراچی اسٹیشن پر عرفان علی اور عسکر مہدی کے علاوہ جماعت اسلامی کی وزارتِ اطلاعات کا نزلہ سید مہدی ظہیر پر بھی گرا ہے۔ وہ عربی جانتے ہیں اور میوزک پروڈیوسر تھے اب انہیں بے عمل کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح خواجہ امداد علی اور حشمت جعفری کو جو عرصہ دراز سے ریڈیو سے وابستہ ہیں ان کے عہدے گھٹا کر ڈیوٹی افسر مقرر کیا گیا ہے۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ جماعت اسلامی کی وزارت اطلاعات ترقی پسندوں اور شیعہ برادری سے تعلق رکھنے والوں کو چن چن کر نکال باہر کرنے یا ان کے عہدے گھٹانے کی مہم میں اپنے ترجمان اخبار جسارت سے کام لے رہی ہے گزشتہ دنوں سے اس اخبار نے سیدہ عصمت زہرہ، نازہ کاظمی، نسیم زہرہ اور سید یاور مہدی کے خلاف کردار کشی کی مہم شروع کر رکھی ہے اس پروپیگنڈے سے پریشان ہو کر عصمت زہرہ طویل رخصت پر چلی گئی ہیں۔ باخبر ذریعوں کا کہنا ہے کہ جماعت اسلامی چاہتی ہے کہ اس کے مخالف کارکنوں کو اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ خود ملازمت چھوڑ جائیں۔ کراچی اسٹیشن پر عالمی سروس کے پروڈیوسر حسن کاظمی کو ریسیپشنسٹ بنا دیا گیا جب کہ جماعت اسلامی قمر علی عباسی، اکرم بٹ، رضی اختر شوق اور ضمیر علی کو پہلے ہی اپنے انتقام کا نشانہ بنا چکی ہے۔

ادھر جماعت اسلامی نیشنل پریس ٹرسٹ کے تحت شائع ہونے والے اخبارات پر بھی کنٹرول قائم کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے۔ پچھلے دنوں جماعت اسلامی کے وزیر اطلاعات محمود اعظم فاروقی نے نیشنل پریس ٹرسٹ توڑنے کا جو اعلان کیا تھا۔ اس کے پس پشت یہ منصوبہ بنایا گیا ہے کہ ٹرسٹ کے اخبار جماعت اسلامی کے حامی سرمایہ داروں اور رجعت پسندوں کو دے دیئے جائیں۔ اس منصوبہ پر عمل ہوتے ہی سب سے پہلے مقدس فریضہ ان اداروں سے روشن خیال اور ترقی پسند کارکنوں کو بے روزگار کر کے انجام دیا جائے گا۔ اس طرح جماعت اسلامی نے ابلاغ عامہ کے اداروں پر ناجائز قبضہ کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے اس پر تیزی سے عمل ہو رہا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ آج کے دور میں گستاپو اور ساواک کی ہم شکل جماعت اسلامی کتنے لوگوں کا معاشی قتلِ عام کرنے میں کامیاب ہوتی ہے؟

*

بھارت اور روس

کے مابین تعلقات میں گرمجوشی باقی ہے

کوسیگن کا دورہ بھارت ہر لحاظ سے کامیاب رہا

شبیہ الحسن

ایران میں پہلوی خاندان کے چراغ بجھنے، سینٹو سے پاکستان، ایران اور ترکی کی علیحدگی، ویت نام پر چین کے حملے اور مشرق وسطیٰ میں جمی کارٹر کے توڑ جوڑ کے نتیجے میں مصر اور اسرائیل کے درمیان مجوزہ معاہدے کے پس منظر میں روس کے وزیراعظم کوسیجن کا دورۂ بھارت خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ بقول بھارتی مبصر روسی وزیراعظم کے دورے سے بھارت کو سیاسی طور پر کوئی فائدہ حاصل ہو یا نہ ہو، اس بروقت ٹرپ سے کرملین کو کامیابی کے نئے امکانات ضرور میسر آ گئے۔

کوسیجن نے اپنے قیام کے دوران امریکہ کے بارے میں باتیں نہیں کیں۔ ماسوا اس کے کہ انہوں نے ایک جگہ ایمٹی اسلحہ کو محدود کرنے کی بات چیت کے بارے میں بتایا کہ بات آگے بڑھ رہی ہے، روس کو ان رپورٹوں سے اس بات پر یقیناً تشویش لاحق ہو گی جن میں انکشاف کیا جاتا رہا ہے کہ امریکی بحری بیڑے نے، بحرِ ہند میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا ہے۔ سابق وزیراعظم مسز اندرا گاندھی بڑی طاقتوں کے اس ارادے پر ہمیشہ کڑی نکتہ چینی کرتی رہیں، مگر انہوں نے روس کا کبھی کھل کر نام نہیں لیا۔ یہ بات امریکہ کے حامیوں کے پیٹ میں خاصی چبھتی تھی۔ اس بار حکمران جنتا پارٹی نے اس کے الزام کے لئے کچھ محتاط رویے کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ "اس علاقے میں کسی بڑی طاقت کو "مخاصمت اور "مقابلہ" کی اجازت نہیں ملنی چاہیے"۔

لیکن بحرِ ہند کے ہمیشہ تازہ رہنے والے موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کے بجائے روسی وزیراعظم نے ویت نام کے خلاف چین کی "جارحیت" کو اپنے دورے کا اہم ترین موضوع قرار دیا۔ انہوں نے لوک سبھا سے خطاب کرتے ہوئے امن، خیرسگالی اور تعاون پر زور دیتے ہوئے چین کی "چودھراہٹ" پر بھرپور حملے کئے ادھر روس کے ہفت روزہ نیو ٹائم میں جو مضمون شائع ہوا، اسی میں چین پر الزام لگایا کہ اس نے بھارت کے دوست ملک ویت نام پر حملے کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جب کہ بھارت کے وزیر خارجہ واجپائی چین کے دورہ پر آئے ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ واجپائی اپنا دورہ مختصر کر کے دہلی چلے گئے۔ بھارتی مبصرین کا خیال ہے کہ بھارت اور چین کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کی جو ابتدائی کوشش، واجپائی کے دورہ سے شروع ہوئی تھی، وہ چین کے ویت نام پر حملے کی وجہ سے متاثر ہوئی۔ انہی حلقوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بھارت کے کچھ سیاسی رہنما جو اس واقعہ سے پہلے تک چین سے تعلقات کی بحالی کی "خوش فہمی" میں مبتلا تھے، اس کے بعد ان کی یہ "خوش فہمی" ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

بھارت میں نیو ٹائم کی رپورٹ کے حوالے سے کہا گیا کہ ویت نام پر حملہ کے لئے ایسے وقت کا انتخاب جان بوجھ کر کیا گیا تھا تاکہ بھارت کو ۱۹۶۲ء میں بھارت پر چین کے حملہ کے تلخ ایام کے ذائقہ کی یاد دلائی جا سکے۔

ان واقعات کے پس منظر میں کوسیجن کا دورۂ بھارت اس اعتبار سے کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے کہ دہلی سے ان کی روانگی سے قبل جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا اس میں چین سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ویت نام کے علاقہ سے اپنی فوجیں واپس بلائے۔ سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ مشترکہ اعلامیہ میں کمبوچیا کا کوئی ذکر نہیں ہے، جب کہ وزیراعظم مرارجی ڈیسائی نے روسی وزیراعظم کے دورہ سے قبل لوک سبھا سے خطاب کرتے ہوئے دونوں علاقوں سے غیرملکی فوجیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ لہٰذا مشترکہ اعلامیہ میں کمبوچیا کے بارے میں خاموشی کو کوسیجن کی ڈپلومیسی کی کامیابی قرار دیا جا رہا ہے۔ بھارتی مبصر نے روس کے وزیراعظم کے دورے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ کوسیجن بھارت میں اپنے قیام کے دوران جس انداز سے چین پر برسے ہیں اس کے نتیجے میں بھارت کے پالیسی سازوں کی راہ تقریباً بند ہو گئی تا آنکہ کوئی معجزاتی واقعہ چین اور بھارت کے درمیان تعلقات کی بحالی کا نیا دروازہ کھول دے۔

روسی وزیراعظم کوسیجن کو لوک سبھا کے بعد دوسرے بڑے اجتماع سے خطاب کرنے کا موقع اس وقت ملا جب نیو دہلی کے شہریوں کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا۔ انہوں نے اس موقع پر بھی چین پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ "ویت نام کے خلاف چین کی جارحیت رجعت پسند عناصر اور مٹھی بھر بددیانت سیاستدانوں کے اشارے پر تھی اور جس نے دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ چینی عوام بھی اس جنگ کے خلاف تھے" انہوں نے متنبہ کیا کہ جن لوگوں نے جنگ شروع کی انہیں اس کے نتائج بھی بھگتنے پڑیں گے"۔

اس دورہ کے سیاسی نتائج سے قطع نظر اقتصادی میدان میں بھارت اور روس کے درمیان کئی تجارتی سمجھوتے ہوئے۔ ایک معاہدہ تو موجود ہے جس کے تحت اس سال روس نے بھارت کو چھ لاکھ ٹن خام تیل فراہم کرے گا۔ اور اس کے عوض بھارت روس کو چاول دے گا اس معاہدہ کی توسیع کی صورت میں روس مزید ۱-۵ ملین ٹن تیل دے گا۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ

ایران کے تیل کی فراہمی بند ہونے سے بھارت کو پٹرول کی جس قلت کا سامنا تھا، اس سمجھوتہ سے اس کی ضرورت بڑی حد تک پوری ہو جائے گی، بھارت کو ابھی دو ملین ٹن گندم کا قرضہ بھی واپس کرنا ہے جو اس نے روس سے لے رکھا ہے۔ ۹، مارچ کو دونوں ملکوں کے درمیان سب سے بڑا تجارتی معاہدہ ہوا جس کے تحت بھارت بُنا ہوا اونی اور سوتی سامان برآمد کرے گا، معاہدہ کی مالیت ۱۳۱ ملین روبل (۴۰ ملین ڈالر) ہے بھارت اور روس کے درمیان طویل المدت تجارتی اور اقتصادی معاہدات گذشتہ سال مارچ میں اس وقت طے ہوئے تھے جب دہلی میں بھارت اور روس کے کمیشن کے درمیان ملاقات ہوئی تھی۔ روسی وفد کی قیادت ڈپٹی وزیر اعظم آئی، وی ارخی پوف نے کی تھی۔

روس اور بھارت کے درمیان روس کے تعاون سے تیار ہونے والے بخارو اسٹیل پلانٹ کے بارے میں معمولی اختلافات تھے۔ یہ اسٹیل پلانٹ عنقریب کام شروع کر دے گا۔ روس نے بھوپال میں قائم شدہ ہیوی الیکٹریکل کو جدید ٹیکنالوجی کی امداد دینے کی پیشکش کی ہے۔ علاوہ ازیں رانچی، بہار میں قائم بھاری انجینئرنگ کے روسی پروجیکٹ کی نئی ضروریات پوری کرنے کے لئے روس اور مشرقی یورپ کے ملکوں نے بھی پیشکش کی ہے

مبصرین کا کہنا ہے کہ بھارت نے روس سے جوہری توانائی کے شعبہ میں بھی تعاون کی درخواست کی ہے اس ضمن میں مرارجی ڈیسائی پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اگر امریکہ تارا پور اسیمٹی پاور پلانٹ کو یورانیم سپلائی کرنے میں ناکام رہا تو بھارت کہیں سے حاصل کرنے میں آزاد ہوگا۔ سوویت یونین بھارت کو ۲۰۰ ٹن ہیوی واٹر کی سپلائی کا بھی وعدہ کر چکا ہے۔

بھارتی مبصرین، کانگریس کے اقتدار سے ہٹنے اور دائیں بازو کی جنتا پارٹی کی اقتدار میں آمد کے باوجود، کوسیجن کے حالیہ دورۂ بھارت کو دونوں ملکوں کے لئے سیاسی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے کامیاب قرار دے رہے ہیں۔ موجودہ حکومت کے امریکہ کی جانب فطری جھکاؤ کے باوجود بھارت اور روس کے درمیان تعلقات میں گرم جوشی باقی ہے جس کی بنیاد کانگریسی حکومت نے بھارت کی خارجہ پالیسی کی سمت مقرر کرتے وقت رکھی تھی۔

●●

عوامی ردِ عمل

مظاہرے اور گرفتاریاں

سپریم کورٹ آف پاکستان کی جانب سے معزول وزیر اعظم بھٹو کی نظر ثانی کی درخواست مسترد کیے جانے کے بعد اندرونِ ملک منتشر ردِ عمل ہوا۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ مسٹر بھٹو عوام میں مقبول نہیں بلکہ یہ ہے کہ فوجی انتظامیہ نے سخت حفاظتی اقدامات کیے ہیں اندرون ملک اور خصوصاً سندھ میں چپہ چپہ پر مسلح محافظ بٹھا دیئے ہیں ہنگامی مراکز قائم ہیں جو براہ راست فوجی افسروں کے کنٹرول میں ہیں علاوہ ازیں پیپلز پارٹی کے تقریباً تمام مقبول نیتا اور ہزاروں سرگرم کارکن جیلوں میں بند ہیں اس کے باوجود منتشر ردِ عمل ہوا۔

۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو راولپنڈی پیپلز پارٹی نے اقبال روڈ پر جلوس نکالا اور بھٹو کی سزائے موت کی منسوخی اور رہائی کے لئے نعرے لگائے لیکن فوراً ہی پولیس نے جلوس کو منتشر کر دیا اور ۲۴ مظاہرین کو جن میں دو خواتین مسرت شبنم اور فخر النساء بھی شامل تھیں، گرفتار کر لیا ان خواتین کو بعد میں رہا کر دیا گیا۔ لیکن بقیہ ۲۲ گرفتار شدگان کو جن میں پیپلز پارٹی راولپنڈی کے قائم مقام جنرل سیکرٹری قاضی سلطان محمود، سیکریٹری نشر و اشاعت رانا اقبال اور سابق ایم پی اے طارق اقبال بھی شامل تھے سرسری سماعت کی فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔

۲۴ مارچ کو ہی میرپور آزاد کشمیر میں عوام نے مظاہرہ کیا اور جلوس نکالا، پولیس چند افراد کو گرفتار کر کے لے گئی۔

اسی دن سری نگر (مقبوضہ کشمیر) میں طلباء نے مسٹر بھٹو کی حمایت میں زبردست مظاہرہ کیا۔ مظاہرین "بھٹو کی سزا منسوخ کرو۔ بھٹو کو رہا کرو" کے نعرے لگا رہے تھے اس دن مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اسمبلی کے ایک رکن عبدالرحمان کابلی ایک تحریک استحقاق پیش کی جس میں مسٹر بھٹو کی جان بخشی کا مطالبہ کیا گیا۔ اسمبلی کے اسپیکر نے اجازت نہ دی اور کہا کہ اس معاملے کے بارے میں وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ بیان دے سکتے ہیں۔

۲۵ مارچ کو سندھ کے دوسرے بڑے شہر حیدرآباد میں بھٹو کی حمایت میں تین مظاہرے ہوئے مظاہرین نے برٹش کونسل کی لائبریری اور امریکی انسٹیٹیوٹ پر پتھراؤ کیا ایک اطلاع کے مطابق پولیس نے اسحٰق کے سات طلباء اور اعجاز، مظہر، دلاور، یامین، زبیر اور سراج کو ہنگامہ آرائی کے الزام میں مارشل لاء کے تحت گرفتار کر لیا۔ علاوہ ازیں پولیس نے سندھ یونیورسٹی کے طلباء پر لاٹھی چارج کیا اور سندھ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے صدر خلیل میمن سمیت جامعہ کے چھ طلباء کو گرفتار کر لیا۔ لیاقت میڈیکل کالج اسٹوڈنٹس یونین کے صدر نے بتایا کہ طلباء کا ایک گروپ ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا کہ پولیس نے اس گروپ کو جلوس سمجھ کر لاٹھی چارج کر دیا اور متعدد طلباء کو گرفتار کر لیا۔ انہوں نے گرفتار شدگان کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔

۲۵ مارچ کو برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی بھاری اکثریت نے پاکستانی سفارتخانے کے سامنے معزول وزیر اعظم جناب بھٹو کی رہائی کے لئے مظاہرہ کیا۔ مظاہرہ پیپلز پارٹی برطانیہ اور اسکرلو کی اپیل پر کیا گیا۔ پنجاب اسمبلی کے سابق اسپیکر شمیم احمد خان، پیپلز پارٹی برطانیہ کے صدر ظفر چوہدری اسکرلو کے صدر الیس لیو قادری، پیپلز پارٹی آزاد کشمیر کے جاوید نظامی اور آزاد کشمیر کے ایک رہنما غازی عبدالرحمان نے مظاہرین سے خطاب کیا۔ غازی عبدالرحمان نے کہا کہ اگر بھٹو کو رہا نہ کیا گیا تو برطانیہ میں مقیم کشمیری زرمبادلہ پاکستان بھیجنا بند کرنے پر غور کریں گے یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت غیر ممالک میں کام کرنے والے پاکستانی تقریباً پندرہ ارب روپے سالانہ کا زرمبادلہ پاکستان بھیجتے ہیں۔

لندن سے موصولہ اطلاعات کے مطابق بھٹو صاحب کے بڑے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو اور پنجاب کے سابق گورنر غلام مصطفیٰ کھر مسٹر بھٹو کی جان بچانے کے لئے اسلامی ممالک کا دورہ کر رہے ہیں۔

★

اقتصادیات

محمد جمیل

ہمارے حکمرانوں کے فیصلے

بروقت ہوتے ہیں اور نہ قومی تقاضوں سے ہم آہنگ

امداد، قرضے یا کھلا استحصال

کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی بنیادی طور پر اس کے معاشی اور سماجی نظام کی مظہر ہوتی ہے اور یہ بیرونی تجارت کی سمت اور دوسرے ممالک کے ساتھ اقتصادی روابط متعین کرتی ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پسِ پردہ کارفرما محرکات اور عوامل کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔

ہندوستان کی آزادی اور اس کے منقسم کے بعد اس خطہ میں برطانوی سامراج کے بعد جو خلا پیدا ہوا اسے دوسری سامراجی قوت نے ایک نئے انداز میں پورا کیا اور اس طرح پرانے نوآبادیاتی نظام کی جگہ جدید نوآبادیاتی نظام نے لے لی۔ پاکستان کے قیام کے تقریباً تین سال بعد اس وقت کے حکمرانوں نے جن کی اکثریت جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتی تھی، اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر نوکر شاہی سے گٹھ جوڑ کر کے پاکستان کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ منسلک کر دیا۔ اس پالیسی کے جواز میں دو وجوہات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ایک تو ہندوستان کی طرف سے ممکنہ حملے کی صورت میں فوجی امداد کی فراہمی اور دوسرے صنعتوں کو فروغ اور ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لئے سرمایہ اور ٹیکنالوجی کا حصول۔

آج اس سال بعد اگر دیانتداری کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کے کے ساتھ جنگ کے وقت پاکستان کے اتحادی نے نہ صرف فوجی امداد، ہتھیاروں اور فاضل پرزوں پر پابندی لگا دی بلکہ اس نے اقتصادی امداد اور قرضے بھی روک دیئے اور صنعت کے شعبہ میں بنیادی صنعتوں کے قیام کے لئے کسی قسم کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ دوسرے ترقی پذیر ممالک کی طرح یہاں کے حکمران طبقے بھی مغرب کے اجارہ دار سرمایہ داروں کے گماشتے اور طفیلی بن گئے۔ درحقیقت چھوٹے ممالک جن کی معیشت عالمی منڈی کے تابع ہوتی ہے وہاں سرمایہ داری نظام اپنی اصلی ہیئت میں پنپ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ ترقی یافتہ ممالک کی حکمتِ عملی کے خلاف ہے کہ کوئی ترقی پذیر ملک وہ مقام حاصل کر لے جہاں وہ اپنا حصّہ طلب کرنے کا اہل ہو جائے۔

سرمایہ دار ممالک اور بین الاقوامی مالیاتی ادارے امداد کے نام پر ترقی پذیر ممالک کو قرضے باہم مشورے اور ساجھے کے طور پر مل جل کر دیتے ہیں تاکہ ان کے مابین رقابت اور ٹکراؤ نہ ہو۔ یہی وہ حکمتِ عملی ہے جو ان ممالک نے اپنے مفادات کے باہمی تضادات کی شدّت کو مدھم کر کے حل کرنے کے لئے اپنائی ہے۔ چونکہ یہ نظام لوٹ کھسوٹ اور استحصال کی بنیاد پر استوار ہے یہ کسی سماج میں استحکام تو کیا لائے گا یہ عوام کو محرومیوں کے سوا کچھ دے ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا معاشرہ میں بار بار اقتصادی اور سیاسی بحران آتے ہیں اور آتے ہی رہیں گے۔ بین الاقوامی مالیاتی ادارے قرض دیتے وقت ایسی کڑی شرائط پیش کرتے ہیں جو ملک کے مسائل کو پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔ ماضی میں ان اداروں نے مختلف ادوار میں کھاد وغیرہ کے کارخانے لگانے میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ روپے کی قیمت میں کمی اور گندم اور کھاد کی قیمتوں میں اضافہ جیسے اقدامات پر مجبور کیا۔ غریب ممالک جن کو مصنوعی ترقی کے جال میں اس بری طرح پھنسا دیا جاتا ہے کہ وہ اس قسم کے دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اس کے نتائج قیمتوں میں بے پناہ اضافہ کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ اگر کوئی حکومت ان اداروں کی شرائط ماننے میں پس و پیش کرے تو امداد میں فوراً کمی کر دی جاتی ہے اور مقامی حکومت کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ خسارہ کی سرمایہ کاری پر بھروسہ کریں جس کا نتیجہ پھر قیمتوں میں اضافہ اور ایک اور بحران پر منتج ہوتا ہے۔

بیرونی ممالک کی بلاواسطہ سرمایہ کاری کے ادائیگیوں کے توازن پر بھی غیر موافق اثرات مرتب ہوتے ہیں کیونکہ مقامی حکومت مصنوعی ترقی کے جذبہ سے سرشار ہو کر بیرونی تجارتی اور صنعتی اداروں کے لئے فراخدلانہ رویّہ اختیار کرتی ہے اور بین الاقوامی بنکوں کے بھرپور تعاون سے یہ ادارے اپنے کاروبار کو وسعت بخشتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر کے بیرونِ ملک بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح ملکی پیداوار اور مقامی محنت کا بہت بڑا حصّہ بیرونِ ملک چلا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مغربی ممالک کی سرمایہ کاری عوام کے اخلاق اور اقدار پر بھی اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ یہ ممالک اپنی سیاسی اور ثقافتی یلغار بھرپور انداز میں کرتے ہیں۔ بیرونی سرمایہ عمومی طور پر ان شعبوں میں لگایا جاتا ہے جہاں منافع کی شرح زیادہ ہو اور وہ انہیں شعبوں میں اجارہ داری قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی مقامی کوشش، کاوش یا ذہانت کسی قسم کی تخلیق کرتی ہے تو گماشتوں اور نوکر شاہی کا گٹھ جوڑ اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔

پاکستان میں عوام کا استحصال جاری رکھنے کے لئے مفاد پرست گروہ یا رجعت پسند سیاسی پارٹیاں یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہم امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی امداد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور بقول ان کے پاکستان اور اسلام کو کمیونسٹ ممالک سے خطرہ لاحق ہے۔ اسی خیالی خطرہ اور مفروضہ کی بنیاد پر پاکستان کو ماضی میں سوشلسٹ ممالک کے خلاف استعمال کیا گیا جس کے نتائج ہم بھگت چکے ہیں۔ درحقیقت اسلام کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ اگر کوئی خطرہ ہے

تو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو ہے۔ لہٰذا وہ اپنے خطرہ کو بڑی چابکدستی سے "اسلام کو خطرہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ یہ آفاقی اصول سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر کسی بھی معاشرہ میں ایک طرف بے پناہ غربت، جہالت، بھوک اور ناانصافی ہو اور دوسری طرف تمام وسائلِ دولت پر مٹھی بھر گروہ کا قبضہ ہو، ارتکازِ زر ہو تو اس معاشرہ میں تضادات ابھریں گے اور محروم طبقے اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر جدوجہد کریں گے اور کسی بھی قسم کے قوانین، ضابطے یا حدود نہیں روک سکتے۔

ان حالات کے پیشِ نظر استحصالی طبقات ہمیشہ کمیونزم کا ہوّا کھڑا کر کے سامراجی کیمپ میں پناہ لیتے ہیں چونکہ وہ ممالک لوٹ میں شریک ہو کر ایک بڑا حصّہ طلب کرتے ہیں لہٰذا استحصال میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال تضاد کو شدید تر کرتی ہے اور ردِ عمل کے طور پر عوامی ابھار کا پیدا ہونا لازم ہے۔

جہاں تک بیرونی امداد کے بغیر ترقی کا سوال ہے جاپان اور روس کی مثالیں ایسی ہیں جنہوں نے بیرونی تجارت اور بیرونی سرمایہ کاری کے بغیر پہلے وہ مقام حاصل کیا جہاں سے وہ مزید بلندیوں کی طرف پرواز کر سکے۔ ان دو ممالک کا تعلق دو مختلف نظام ہائے معیشت سے تھا۔ مگر انہوں نے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک ایسا اقتصادی ڈھانچہ ترتیب دیا جس سے وہ ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ اقتصادی روابط سے اپنے مفادات آگے بڑھا سکے اور آج اقتصادی لحاظ سے دنیا کی مضبوط ترین اکائیوں میں تصور کئے جاتے ہیں۔ لوگوں نے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے ایک لمبے سفر کے بعد ایسے طریقے اور اصول وضع کئے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے نہ صرف ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کی جا سکتی ہیں بلکہ ایک بہتر معیارِ زندگی کا حصول بھی ممکن ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت کے طلب اور رسد جیسے قوانین کو بے لگام چھوڑنے کی بجائے عوام الناس کے لئے ایک بہتر زندگی کی ضمانت مناسب منصوبہ بندی کے ذریعہ مل سکتی ہے۔

پاکستان میں منصوبہ بندی بیرونی طاقتوں کے اشاروں پر کی جاتی رہی ہے۔ اپنے وسائل پر بھروسہ کے بجائے ہارورڈ کے مشیروں پر تکیہ کرتے ہوئے سارا زور درآمدات کی بنیاد پر صنعتوں پر دیا گیا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ ترجیحات کی بنیاد پر صنعتیں لگانے کی بجائے امداد دینے والے ممالک کی منشا اور رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ بعض اوقات وہ کارخانے جو ملک کے خصوصی حالات یا وسائل کے حوالے سے قابلِ عمل نہ تھے ان کو امداد حاصل کرنے کی خاطر منفعت بخش بنا کر پیش کیا گیا۔ ان ممالک میں جہاں سرمایہ کی کمی ہو اور افرادی قوت زیادہ، وہاں چھوٹی صنعتوں کا قیام ایک بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے جو مستقبل میں سماجی اور اقتصادی ہم آہنگی کا آئینہ دار ہو سکتا ہے۔ پاکستان چونکہ نیم جاگیردارانہ نیم سرمایہ دارانہ اور نیم نوآبادیاتی سماجی نظام ہے لہٰذا قومی سرمایہ دار کا تشخص بھی نہ ابھر سکا، لہٰذا وہ اشیاء جو پاکستان میں تیار ہو رہی ہیں اس کی درآمدات کے خلاف بھی کوئی قابلِ ذکر ردِ عمل دیکھنے میں نہیں آیا۔

کچھ لوگ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر پاکستان مکمل طور پر امریکہ کی گود میں چلا جائے تو یہ اتحادی جو بیانات کی حد تک ہمارے ملک کی سلامتی، یکجہتی اور آزادی کو اپنی خارجہ پالیسی کا ستون بتاتا ہے مگر جس نے عملاً کبھی کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کیا تو بقول ان کے وہ پاکستان کو ٹیکنالوجی فراہم کرے گا۔ ہم ان بقراطوں سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا پچھلے تیس سالوں میں پاکستان کی طرف سے TOTAL COMMITTMENT نہ تھی؟ صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی ترقی یافتہ ملک کبھی یہ نہیں چاہتا کہ ترقی پذیر ممالک میں بنیادی نوعیت کی صنعتوں کا قیام عمل میں آئے کیونکہ ایسے حالات میں وہ اپنی مصنوعات کس جگہ برآمد کریں گے اور وہ اپنے ملک میں محنت کشوں کا معیارِ زندگی کیسے برقرار رکھ سکیں گے؟ دنیا کے بیشتر ممالک، وہ کسی بھی مذہب یا نظریہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ موجودہ دور میں صرف اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر پالیسیاں مرتب کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ چند ممالک دوسرے ممالک کے حقوق پامال کئے بغیر اپنے مفادات کا تحفظ چاہتے ہیں۔

پاکستان ایک پسماندہ ملک ہے اور یہ بڑی طاقتوں کی زور آزمائی میں کسی ایک کا اتحادی بننے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا صرف بیان بازی کی حد تک نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ یہ اسی صورت ممکن ہے جب پاکستان اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے بیرونی طاقتوں پر کم سے کم انحصار کرے اور ملک کے اندر ایک منصفانہ معاشرہ کے قیام کے لئے سمت متعین کرے۔ عوام الناس میں جذبۂ وطنیت پیدا کرنے کے لئے اور ان کو اعتماد میں لینے کے لئے جاگیرداری نظام کو جڑ سے اکھاڑنا ضروری ہے۔ اس کے نتیجہ میں پیداواری قوتیں برسرِ پیکار ہوں گی اور پیداوار بڑھا کر زرِ مبادلہ کے نقصان کو کم سے کم کریں گی۔ ملک کے استحکام کے لئے بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر ترقی یافتہ علاقوں کو ترقی یافتہ علاقوں کے قریب لایا جائے اور ماضی میں جو صوبے نظر انداز کئے گئے ہیں، ترجیحی بنیادوں پر ان کی کمی کو پورا کیا جائے۔ معاشی ہم آہنگی یقینی طور پر ثقافتی اور ذہنی ہم آہنگی پیدا کرے گی اور ایک خوشحال پاکستانی قوم تشکیل پائے گی۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ایک آزاد، مثبت اور غیر جانبدار خارجہ پالیسی اختیار کر کے وہ مقام حاصل کر سکتے ہیں جس کی بنیاد پر عالمی طاقتیں ہماری شرائط پر یا برابری کی بنیاد پر اقتصادی معاہدے کرنے پر مجبور رہوں گی۔

یہ صرف پاکستان یا اس کے عوام کے مفادات نہیں بلکہ عالمی برادری کے مفادات اس بات کے متقاضی تھے کہ پاکستان سینٹو سے علیحدگی اختیار کرے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے قائدین جو بھی اقدامات یا فیصلے کرتے ہیں وہ بروقت نہیں ہوتے یا قومی ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ جب عراق میں انقلاب برپا ہو گیا تو ہم معاہدہ بغداد سے علیحدہ ہو گئے۔ جب جنوب مشرقی ایشیا میں پاکستان ٹوٹنے کے بعد بنگلہ دیش کا قیام عمل آیا تو ہم سیٹو سے نکل گئے۔ آج جب شہنشاہ اور سامراجی مفادات پر ضرب کاری پڑی تو ہم سینٹو سے علیحدہ ہو گئے۔ ہمارے قائدین آنے والے حالات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور انہیں کے باعث بدنامی کا طوق اور رسوائی ہمارے ملک کا مقدر بن چکی ہے۔

محبِ وطن لوگوں کو اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ پاکستان اور اس کے عوام اقتصادی یا سیاسی طور پر اس کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ وہ اس خطے میں سامراج کے چوکیدار یا "گن مین" کا کردار ادا کریں۔ امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدے جو پاکستان کے ساتھ ہیں اس کے بارے میں فخر محسوس کرنے کے بجائے نئی حقیقتوں کو سمجھنا چاہیئے۔ اب وقت آگیا ہے کہ مغربی ممالک کے ساتھ منسلک معاشی اور سماجی ڈھانچے میں دور رس تبدیلیاں کریں اور عالمی سودی نظام سے قطع تعلق کریں، صرف اس طریقے سے ہم عالمی سیاست میں صحیح کردار ادا کر کے جائز مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ ●●

...... ناشکر گزار اور غالب آتے گئے

اہل اقتدار اپنے امتیازات کے بے بس قیدی بن جاتے ہیں

ظفر قریشی

پلوٹارک کی کتاب میں جابجا ایسے جملے بکھرے ہوئے ہیں جنہیں نقل کرنے اور حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سارے جملے پلوٹارک کے نہیں ہیں وہ چند جملوں کا مصنف ہے اور باقی جملوں کا مورخ۔ پلوٹارک سے میرا مفصل تعارف اس چھوٹے سے کاغذ کے پرزے کی بدولت ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ پری کلیس بڑا پُرنظر تھا۔ کتاب کھولی اور پری کلیس کا باب نکالا۔ اس میں دو جرنیلوں کا مکالمہ درج تھا سوفوکلیز سے کسی نے حسن کا ذکر کیا۔ بات نظارہ بازی کی تھی۔ پری کلیس نے جواب دیا "میرے دوست، ایک جرنیل کے ہاتھ ہی نہیں اس کی نظر بھی پاک ہونی چاہیئے۔" اس پاک نظر کا ذکر سکندر اعظم کے باب میں بھی درج ہے کہتے ہیں کہ سکندر نے ایرانی سپاہ کے خلاف بڑی بے جگری دکھائی اور ایرانی خواتین کے ساتھ بڑی دلداری سے پیش آیا وہ شجاعت سے زیادہ شرافت کے لئے ممتاز تھا

اقتباس از کتاب:۔ "آوازِ دوست" مصنف مختار مسعود

پاکستان میں ہمیشہ افسر اور تاجر کی جیت رہی ہے

۱۹۷۰ء میں ہم نے اپنے مشرقی صوبے میں کیا کیا گل کھلائے؟ ذمہ دار افراد کو کیا سزا ملی؟ کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں پوچھتا۔ جو جاننے کی کوشش کرے گا یا پوچھنے کی کوشش کرے گا وہ گردن زدنی قرار دیا جائے گا ہمارے ہاں کس کے ہاتھ کتنے پاک تھے اور کس کی نظر کتنی پاک تھی یہ کون پوچھے؟ مختار مسعود صاحب نے اپنی اعلیٰ افسر والی حیثیت کا فائدہ اٹھایا "آوازِ دوست" میں کچھ اشارے کیئے اور ترقی کی قطار میں کھڑے ہو گئے آج وہ ماشاء اللہ سے ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں اور علاقائی تعاون برائے ترقی کے سیکریٹری جنرل بھی، اپنی اس کتاب میں گو انہوں نے کھل کر کوئی بات نہیں کی ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ سوچنے والوں کے لئے اس کتاب میں دیئے گئے اشاروں میں حکمت کے بڑے بڑے موتی پنہاں ہیں انشاء اللہ اگر آپ کو توفیق رہے اور افراطِ زر سے آپکی کبھی گلو خلاصی ہو تو یہ کتاب ضرور خریدیئے گا اور پڑھیئے گا کہ اس کے مطالعے سے قوم کا مزاج سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ کتاب میں صرف دو مضامین ہیں "مینارِ پاکستان" اور "قحط الرجال"۔ مینارِ پاکستان متحدہ پاکستان کے المیئے پر نوحہ ہے اور قحط الرجال ان حالات کا مرثیہ جن میں ہم آپ سانس لے رہے ہیں کہنے کو تو مختار مسعود بھی سول افسر ہیں اور الطاف گوہر بھی تھے لیکن دونوں میں فرق کتنا واضح ہے ایک نے "آوازِ دوست" تحریر کی اور دوسرے کو اپنے دورِ اقتدار میں پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کا مصنف بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مختار مسعود نے کتاب لکھی کچھ قحط الرجال کا رونا رو دیا اور علاقائی تعاون برائے ترقی کے سیکریٹری جنرل بن کر چلے گئے الطاف گوہر نے سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے ہی تخلیق کردہ پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کی خلاف ورزی کر کے ہیرو بننے کی کوشش کی، جیل گئے، مودودی کی تفہیم القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا روڈی پلانٹ کا منفعت بخش انتظام سنبھال کر مفاہمت کی اور اب لندن میں بیٹھ کر ۱۹۶۵ء کی جنگ کو جس میں ہمارے خیال میں ہمیں فتح نصیب ہوئی تھی لیکن جب ایوب خان تاشقند میں مذاکرات کی میز پر ہار بیٹھا تھا ذوالفقار علی بھٹو کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شکست تو ہوئی تھی ۱۹۶۵ء کی جنگ کے نتائج بھی متنازعہ ہو گئے۔ خدا ہر قوم کو ایسے لوگوں سے محفوظ رکھے (آمین)

بات جنگ کی ہو رہی تھی سکندر اعظم کا ذکر کرتے ہوئے مختار مسعود کہتے ہیں کہ وہ گفتار و کردار دونوں کا مرد میدان تھا وہ پارسیوں کو لاجواب کرنے اور دارا کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا لیکن جب وہ سائرس کی قبر پر پہنچا تو نامرادی نے گھیر لیا وہ دل گرفتہ ہوا کہ اس جوش و خروش اور جنگ و جدل کا انعام دنیا کو سب سے بڑی سلطنت کی صورت میں مل سکتا ہے مگر اس کا انجام محض قبر کی تنہائی اور تاریکی ہو گا سکندر کو سائرس نے رنجیدہ کیا اور جولیس سیزر کو سکندر اعظم نے سیزر نے سکندر کا حال پڑھا تو رونے لگا کہ میری عمر تک سکندر کتنے ہی ملک فتح کر چکا تھا اور میرے اعمال نامے میں ابھی تک ایک درخشاں کارنامہ بھی نہیں ہے جولیس سیزر کا یہ جملہ میں نے پڑھا اور میں بھی آزردہ ہوا۔ سکندر اعظم کی سوانح کا ایک استعمال جولیس سیزر نے کیا تھا۔ اور دوسرا ہمارے نقیروں نے جو خیرات مانگتے ہوئے صرف اتنا یاد دلاتے ہیں کہ ؎

سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

چند ہاتھوں نے دنیا بھر سے خراج وصول کیا ان کے حوالے سے یہ لوگ خیرات مانگتے ہیں کیونکہ افراد اور اقوام واقعات سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق سبق حاصل کرتے ہیں"۔

مختار مسعود کے جملوں کی کاٹ مزید ملاحظہ کیجئے

★ شاید ان بیس سالوں (قیام پاکستان کے) میں صرف افسر اور تاجر ہی جنتی رہیں۔

★ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیئے اور سزا کے طور پر روک لیئے جاتے ہیں عطار تو اسی کے حق میں ہوتی ہے جو حقدار ہو۔ آخر قدرت ایک سپاس ناآشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے اسے اپنے عطیے کی رسوائی اور بے قدری ناگوار گزرتی ہے عطار کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اس کا شکر ادا کرے۔

★ دلِ شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے شکوہ کیجئے تو بجھ جاتا ہے ناشکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے شکر گزار ہمیشہ روشن ضمیر اور روشن دماغ ہوتا ہے ناشکر گزار بے ضمیر اور بد دماغ ہو جاتا ہے۔

★ پاکستان ملا تو شکر گذاروں پر ناشکر گذار غالب آئے تعداد کا حساب تو اللہ بہتر جانتا ہے مگر آواز اور اقتدار میں ہمیشہ ناشکر گذار کو فوقیت رہی۔

★ ناشکر گذاری کا نتیجہ بے ہنری کی صورت میں سامنے آتا ہے اور جہاں ناشکر گذار اور بے ہنر جمع ہو جائیں وہاں منافقت کا دور دورہ رہتا ہے جب اشراف کی حاجت ہی نہ رہے تو کوئی ان کی تلاش اور دلجوئی کیوں کرے۔

★ ہنرور کی قدر ناشناسی سے بے ہنری کو فروغ ملتا ہے کم ظرف کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے تو اشراف کی عزت میں کمی ہو جاتی ہے منافقت کے لئے یہ فضاء بڑی سازگار ہوتی ہے۔

★ منافق کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور دو قدم زبان کے ساتھ اٹھاتا ہے اور چار قدم دل ہی دل میں پیچھے چلا جاتا ہے جس قافلے میں ایسے مسافر شامل ہوں اسے نہ کبھی سمت ملتی ہے اور نہ منزل جہاں سے اُسے آگے روانہ ہونا چاہیئے وہاں سے وہ پسپائی اور رسوائی کی راہ پر نکل جاتا ہے۔

★ ایسے کارواں میں عبرت اور ذوق کی کمی اور بے کسی و بے دلی کی فراوانی ہوتی ہے کیونکہ عبرت وہ پکڑتے ہیں جو شکر کرنا جانتے ہوں ذوق ان میں ہوتا ہے جو شرف و ہنر رکھتے ہوں تمنا ان کی جوان ہوتی ہے جو منافقت سے ناآشنا ہوں اگر دلِ تشکر کی طرف نہیں آتا، دماغ ہنر کی طرف نہیں جاتا اور زبان حق کی طرف مائل نہیں ہوتی تو انسان انسان نہیں رہتا بلکہ دشت و صحرا میں بدل جاتا ہے جب چاروں طرف بیکراں دشت آدم زاد کی شکل میں پھیلے ہوں تو اس صورتحال کو قحط الرجال کہتے ہیں کہنے کو تو یہ چند جملے ہیں۔ لیکن اگر آپ انہیں بغور پڑھیں تو ان میں وہ گہرائی و گیرائی ہے جو لاکھوں صفحات پر مشتمل کتابوں پر بھاری ہے ممکن ہو تو مولوی تمیز الدین خان کا کیس بھی یاد کر لیجئے۔ وہ منیر نامی کوئی منصف تھا جس نے ایک بیج بویا تھا نفاق کا۔ اسی نے ملک میں جمہوری اداروں کو کمزور کرنے کا اقدام جائز قرار دیا اس طرح ایک غلط اقدام نے دوسرے غلط اقدام کو جواز بنایا اور دوسرے غلط اقدام نے تیسرے کی راہ ہموار کی۔ ناشکر گذار غالب آتے گئے جن کے بارے میں مختار مسعود صفحہ ۴۳۷ پر کہتے ہیں "اقتدار کی سرمستی اختیار کا نشہ، قوت کا غرور اور امتیازات کا سرور ان کے رگ و پے میں سما جاتا ہے عقل اور آنکھوں دونوں پر پردہ پڑ جاتا ہے ان کے چرچے بھی ہوتے ہیں اور کم نظر ان پر رشک بھی کرتے ہیں یہاں تک کہ مقررہ وقت آن لگتا ہے ان کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور لوگ ہیں کہ بوٹیاں نوچ لیتے ہیں۔"

اب آپ دیکھیں کہ وعدہ ہوا ہے کہ ۱۷ نومبر کو قوم کی امانت لوٹانے کے لیئے عملی اقدام کیا جائے گا مگر اس سے قبل بھی بہت سے وعدے ہوئے تھے وہ پورے نہیں ہوئے تو اس سے تازہ ترین وعدے کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے ہو سکتا ہے کہ اس مرتبہ بھی کچھ بے ہنر پہنچ جائیں اور ہاتھ جوڑ کر وعدے کرنے والوں کو وعدہ پورا کرنے سے باز رکھیں۔ ایسی صورت میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے اور کیا کر سکتا ہے کیونکہ پہلے زمانے میں آدمی اپنے کردار اپنی زبان، اپنی لیاقت اور اپنی صلاحیت سے بڑا بنتا تھا آج اسے بڑا بننے کے لئے توپ و تفنگ کی ضرورت ہوتی ہے توپ و تفنگ سے کتابیں تحریر نہیں کی جاتیں لیکن ان سے اڑانے کی دھمکی دیکر تخلیق کے سوتے بند کیئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ قارئین کرام "آمنا و صدقنا" کا موجودہ شور جب آپ کی سماعت پر گراں گذرنے لگے تو مختار مسعود کا یہ جملہ پڑھ لیجئے " اہل اقتدار و اہل اختیار کی زندگی میں ایک دروازے سے اقتدار و اختیار داخل ہوتے ہیں اور دوسرے سے اعتدال اور توازن رخصت ہو جاتے ہیں جس نقار خانے میں نعرون تالیوں اور آمنا صدقنا کا شور ہو وہاں اعتدال کی حیثیت طوطی سے بھی کمتر ہوتی ہے حاضر خباب اور حاضر باش غرض مندوں کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں۔ حق گو جو تنہائی پسند ہوتے ہیں اس بھیڑ سے چھٹ جاتے ہیں اہل اقتدار کے کان کلمۂ حق سے محروم ہو جاتے ہیں اور کچھ عرصے بعد یہ کلمہ اتنا نامانوس ہو جاتا ہے کہ نہ اسے سننے کی تاب رہتی ہے اور نہ سمجھنے کی توفیق ہوتی ہے ہر وقت آگے چلنا اونچا بیٹھنا پہلے بولنا اور آخری حکم لگانا زہر کی طرح خون میں سرایت کر جاتا ہے حضرت عمرؓ نے اسی لئے خدام کے قدموں کی چاپ کو مہلک قرار دیا تھا۔ مگر یہ نکتہ ہر ایک کی گرفت میں نہیں آتا۔ اہل اقتدار اپنے امتیازات کے بے بس قیدی بن جاتے ہیں۔"

مزید کیا عرض کیا جائے سوائے اس کے تینے تجربات کے بعد بھی اگر اہل اقتدار نے (جن کی اکثریت ناشکر گذاروں پر مشتمل ہے) سبق نہ سیکھا تو اللہ تعالیٰ بالآخر ان سے اپنی ایک ایک نعمت کا حساب لے گا اپنی ہی قوم کو بار بار فتح کرنا اور اس کا مخدوم بنکر اس کے ساتھ خادموں کا سلوک کرنا قابل تعریف فعل نہیں اور قوم کے وہ نام نہاد رہنما جو اس فعل میں شریک تھے یا ہیں یا آئندہ ہوں گے ان کے حشر کی کبھی کسی نے ضمانت نہیں دی۔

* * *

سندھ

این ایس ایف

کا کنونشن

*

غلام اکبر

بھٹو کی سزائے موت کی منسوخی اور تعلیمی ادارے کھولنے کا مطالبہ

جام ساقی، سیاسی کارکنوں اور طلبا کو رہا کیا جائے

۴ مارچ کا دن سندھ کی طلباء تحریک میں نہایت اہم حیثیت کا حامل ہے کیونکہ ۱۹۶۷ء میں اس روز سندھ کے طلباء کی اس جد و جہد کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا جو قومی حقوق کے حصول، صوبائی خود مختاری اور ون یونٹ کے خاتمے کے لئے تھی۔ ۴ مارچ ۱۹۶۷ء کو سندھ یونیورسٹی سے حیدرآباد شہر تک کے لئے نکالے گئے ایک جلوس کو پولیس نے جامشورو پل پر روک کر اندھا دھند فائرنگ کی تھی جس سے متعدد طلباء و طالبات شدید زخمی ہو گئے تھے اور متعدد طالبات کو گرفتار کیا گیا۔ اس واقعے کے خلاف سندھ بھر میں احتجاج کی شدید لہر دوڑ گئی تھی جس نے سندھ کی منتشر طلباءُ

تحریک کو ایک ہمہ گیر اور مربوط شکل دے دی اور پھر ایک تحریک کی صورت میں آگے چل کر ایوبی آمریت کے خلاف ملک بھر کے عوام کی جمہوری جدوجہد کا ایک فعال حصہ بن گئی تھی۔

سندھ کی طلبا تنظیمیں ہر سال "یوم ۴ مارچ" جوش و خروش سے مناتی ہیں لیکن اس سال تمام تعلیمی ادارے بند، متعدد طلبار جیلوں میں ہونے، بے شمار کے وارنٹ گرفتاری ہونے اور ترقی پسند طلباء کو کسی بھی قسم کے اجتماع کی آزادی نہ ہونے کے سبب "یوم ۴ مارچ" روایتی شان و شوکت کے ساتھ منایا نہ جا سکا لیکن سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا کہ سندھ کے طلبار کی اس عظیم جدوجہد کی یاد منانے کے لئے کراچی میں اپنا ساتواں مرکزی کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس تاریخی دن کی یاد ایس این ایس ایف کی تنظیم نو اور آئندہ کے لئے نیا لائحہ عمل مرتب کر کے منائی جائے۔

اس طرح سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر "یوم ۴ مارچ" منایا لیکن ایس این ایس ایف کا ساتواں مرکزی کنونشن بھی روایتی نہیں تھا۔ اس سے قبل ہر کنونشن کے انعقاد کا بہت پہلے سے اعلان کیا جاتا تھا۔ پوسٹر لگائے جاتے تھے اور خوب پبلسٹی کی جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ کارکن اور ہمدرد کنونشن میں شریک ہوتے تھے اور کنونشن کے بعد جلسہ عام ہوتا تھا لیکن اس مرتبہ کنونشن کی ساری تیاریاں اس کے بالکل برعکس تھیں۔ کنونشن کا پہلے سے کوئی اعلان نہیں کیا گیا کیونکہ نذیر عباسی، غلام رسول سہتو، غلام حسین سٹر، انعام رند، سرفراز میمن، آصف رضوی، شاہجہاں سندھی، شبیر بیدار سندھی، صفت رند، تاج مری، اللہ جڑیو سیال، نواز شیخ، امر لعل، گھنشام پرکاش بخشل سندھی اور امداد چانڈیو سمیت ایس این ایس ایف کے تیس سے زائد کارکنوں کے وارنٹ جاری ہیں۔ کنونشن کے ممکنہ شرکاء کی اکثریت روپوشی کی زندگی گزار رہی ہے لہٰذا کونسل سیشن کا اعلانیہ انعقاد کسی بھی طور سے مناسب نہیں تھا اور پھر کراچی میں ایک اور طالب علم تنظیم این ایس ایف کے مرکزی صدر رحمان عالم اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کی مثال بھی سامنے تھی جن کو اپنے کونسل سیشن کے انعقاد کے لئے محض ایک میٹنگ کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔

کنونشن سے ایک ہفتے قبل ایس این ایس ایف کی تمام ضلعی تنظیموں نے اپنے مندوبین منتخب کئے جن کو کراچی کی مختلف جگہوں پر پہنچنے کے لئے کہا گیا تھا۔ تمام مندوبین ۳ مارچ تک کراچی پہنچ چکے تھے کنونشن کی جگہ کے متعلق کسی کو بھی علم نہ تھا۔ کراچی کے تمام سرگرم کارکن بھی اس سلسلے میں قطعاً لاعلم تھے۔ کنونشن کی تین رکنی انتظامی کمیٹی نے ۳ مارچ کو کنونشن کا ایجنڈا تمام مندوبین کو پہنچا دیا تھا اور ان سے کہا گیا کہ اگلے روز دس بجے تک تمام لوگ تیار ہو جائیں۔ صبح سویرے ایس این ایس ایف کراچی کے تمام سرگرم کارکنوں کو انتظامی کمیٹی نے کنونشن کے مقام سے آگاہ کیا اور ہر کارکن کے ذمہ مختلف مقامات پر ٹھہرے ہوئے مختلف مندوبین کو کنونشن کی جگہ تک پہنچانے کی ذمہ داری دے دی گئی۔

کنونشن کراچی کے محنت کشوں کی ایک گنجان بستی میں ایک گھر میں ہوا۔ ایک کمرے میں تمام لوگ دریوں پر بیٹھ گئے جہاں کوئی بینر، جھنڈا، یا پلے کارڈ نہیں تھے۔ کنونشن کا آغاز ہوا ایس این ایس ایف کے سبکدوش ہونے والے سیکریٹری جنرل صفت رند نے اناؤنسمنٹ کے فرائض سنبھالے۔ سبکدوش ہونے والے سینیئر نائب صدر غلام رسول سہتو نے صدارت کی۔ کنونشن کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے صفت رند نے کہنا شروع کیا "ایس این ایس ایف کے انقلابی کارکنوں کے اس اجتماع کی اکثریت آج ایسے ساتھیوں پر مشتمل ہے جنہیں پولیس سیاسی مقدمات کے سلسلے میں سختی سے تلاش کر رہی ہے لیکن وہ گرفتاری کی پرواہ کئے بغیر روپوشی کی حالت میں سندھ کے دیہاتوں اور شہروں میں طلبار سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں اور اپنی جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ آج ہمارے ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد جیلوں میں ہے لیکن ہمارے یہ بہادر ساتھی گھروں سے نیند کے عالم میں قطعاً گرفتار نہیں ہوتے ہیں بلکہ جلوس نکالتے ہوئے، مظاہرہ کرتے ہوئے، چاکنگ کرتے ہوئے یا اس قسم کے دیگر سلسلوں سے گرفتار ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے ساتھیوں کی انفرادیت ہے کہ وہ اپنی جدوجہد میں کسی خوف کی پرواہ نہیں کرتے ہیں لیکن جب حکومت کی منشا یہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھیوں کو گرفتار کر کے طلبا اور محنت کش عوام سے کاٹ دے تو ہمارے کارکن روپوش ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے کارکن تعلیمی اداروں میں طلبار سے رابطہ برقرار رکھتے ہیں اور اب جبکہ سندھ بھر کے تعلیمی ادارے جبری بندش کا شکار ہیں۔ ہمارے کارکن سندھ کے دیہاتوں میں دشوار گزار فاصلے طے کر کے پہنچتے ہیں اور طلباء سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔"

صفت رند مسلسل بولتے چلے جا رہے تھے "یہ ایس این ایس ایف کے کارکنوں کی شعور کی معراج ہے کہ وہ تعلیمی اداروں کی تعطیلات اور بندش کے دوران دیہاتوں میں طلبار کو منظم کرنے کے ساتھ ساتھ کسانوں اور ہاریوں کو بھی منظم کرنے کا دہرا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے کارکن انہیں سندھ ہاری کمیٹی میں منظم کرتے ہیں۔ اگر آج سندھ ہاری کمیٹی سندھ کے تقریباً بیشتر دیہاتوں میں منظم ہو چکی ہے تو ایس این ایس ایف کے کارکنوں کی کوششوں کو بھی اس میں بے حد دخل ہے۔" انہوں نے کہا کہ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن اندرون سندھ واحد طلباء تنظیم ہے جس نے اپنے کارکنوں کی نظریاتی تربیت اس طرح کی ہے کہ کارکنوں کی اکثریت تعلیمی زندگی کے بعد طبقاتی اور عملی سیاست میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ ہماری تنظیم کے اکثر پرانے کارکن آج سندھ ہاری کمیٹی، پاکستان ورکرز فیڈریشن، سندھی ادبی سنگت اور ترقی پسند سیاسی پارٹیوں میں سرگرم عمل ہیں۔ ہماری تنظیم کے بانی جام ساقی سے اس عظیم روایت کا آغاز ہوا تھا اور آج تک جاری ہے۔ آج ہمارے ایجنڈے میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ ہم اپنے سبکدوش ہونے والے سینیئر مرکزی نائب صدر غلام رسول سہتو، جونیئر مرکزی نائب صدر تاج مری اور مرکزی جوائنٹ سیکریٹری غلام حسین سٹر سمیت اپنے متعدد ساتھیوں اور دوستوں کو ایس این ایس ایف سے اس لئے الوداع کہیں کہ وہ اپنی تعلیمی زندگی مکمل کر چکے ہیں آج ہم انہیں سندھ ہاری کمیٹی میں شمولیت کی رسمی اجازت دیں گے۔ ایسا ہم ان کی خواہش پر ہی کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ سندھ ہاری کمیٹی میں ممتاز انقلابی رہنما جام ساقی اور ان کے بہادر ساتھیوں کی روایات قائم رکھیں گے۔"

ایس این ایس ایف کے سبکدوش ہونے والے جونیئر نائب صدر امداد چانڈیو نے تنظیم کی کارگزاری کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا ساتواں مرکزی کنونشن ایسے وقت منعقد ہو رہا ہے جب ایس این ایس ایف اپنے قیام کے دس سال مکمل کر چکی ہے لہٰذا محض گزشتہ سال کی کارکردگی کا جائزہ لینے کی بجائے ہم ایس این ایس ایف کی دس سالہ کارکردگی کا اجتماعی جائزہ لیں۔ امداد چانڈیو نے ایس این ایس ایف کے قیام کا پس منظر اور اس کی دس سالہ طویل جدوجہد نہایت تفصیل سے بتائی۔ اس رپورٹ کو طویل بحث و مباحثہ کے بعد اور مختلف ترمیمات کے بعد منظور کیا گیا۔ رپورٹ کی منظوری کے بعد انتخابات عمل میں آئے نذیر عباسی کو تیسری بار مرکزی صدر منتخب کیا گیا۔ انتخابات کی تفصیل یہ ہے۔ صدر نذیر عباسی، سینیئر نائب صدر صفت رند، نائب صدر سرفراز میمن، نائب صدر غلام اکبر، سیکریٹری جنرل گھنشام پرکاش، جوائنٹ سیکریٹری حمیدہ گھانگھرو، سوشل سیکریٹری ساغر سیمجو، پریس سیکریٹری شیر محمد منگریو، خزانچی زنجن۔

اس کے علاوہ ۲۱ رکنی مرکزی مجلس عاملہ بھی منتخب کی گئی۔ انتخابات سے قبل ایک تعزیتی قرارداد منظور ہوئی جس میں جام ساقی کی اہلیہ کی اچانک موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ بیگم جام ساقی کی موت جام ساقی پر کئے جانے والے تشدد کی خبروں سے صدمہ کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ قرارداد کی منظوری کے بعد مندوبین نے کھڑے ہو کر بیگم جام ساقی کی یاد میں دو منٹ کے لئے خاموشی اختیار کی۔ کنونشن کے پہلے روز مختلف مقررین نے خطاب کرتے ہوئے ہر سطح تک مفت تعلیم دینے

اور مادری زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنا دینے، ذوالفقار علی بھٹو کی موت کی سزا کی منسوخی، ممتاز رہنما جام ساقی پر تشدد کے خاتمے اور ان کو عدالتی تحویل میں دینے، افراسیاب خٹک، حسین نقی، رسول بخش پلیجو، مخدوم خلیق الزماں، محمد خان منیگل، شیر محمد جان ساغر سمیجو، علی حیدر شاہ، اورنگ زیب کالسی، امام بخش پیرزادہ اسلم پرویز، جان عالم، نوشاد چندریگر، زرینہ بلوچ، عزیزہ سومرو رحمت شاہ سائل، محمد رمضان، حیدر جتوئی، نواز جسکانی، سردار مانڈرا، سمیت تمام گرفتار شدہ طالب علموں، مزدوروں، فنکاروں اور سیاسی کارکنوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

کنونشن کے دوسرے روز تعلیمی امور، طلباء مسائل اور ملکی اور بین الاقوامی سیاسی مسائل پر متعدد قراردادیں منظور کی گئیں سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے متعلق متعدد تنظیمی فیصلے بھی ہوئے اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل طے کیا گیا ●

پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن

●●●●●●●●●●●●●●

پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن گورنمنٹ کالج درگئی (مالاکنڈ) کا ایک اجلاس زیر صدارت محمد اسماعیل صدر پی ایس ایف گورنمنٹ کالج درگئی منعقد ہوا۔ اجلاس سے پی ایس ایف گورنمنٹ کالج درگئی کے رہنما شاہد حیات کے علاوہ اسلامیہ کالج کے محمد ریاض گورنمنٹ کالج مردان اسٹوڈنٹس یونین کے سابق صدر محمد یوسف شاہین اور شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی کے اسد اللہ آفریدی نے خطاب کیا۔

مقررین نے ملک کی موجودہ سیاسی و معاشی صورتحال کو تشویشناک قرار دیتے ہوئے مارشل لاء کے خاتمے اور عام انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا اجلاس میں متعدد قراردادیں منظور کی گئیں جن میں مطالبہ کیا گیا کہ ملک بھر کے تعلیمی ادارے فوراً کھول دیئے جائیں۔ اور طلباء کا مزید وقت ضائع نہ کیا جائے درگئی کالج کو ڈگری کا درجہ دیا جائے کالج میں این سی سی کا اجراء کیا جائے اور طلباء کے لیے رہائشی ہاسٹل تعمیر کیا جائے مالاکنڈ سازش کیس ختم کیا جائے اور افراسیاب خٹک سمیت تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے انقلاب افغانستان کے خلاف رجعتی قوتوں کا پروپیگنڈہ بند کیا جائے اور افغانستان کے بھگوڑوں کو پناہ نہ دی جائے۔ مارشل لاء کا خاتمہ کر کے عام انتخابات کرائے جائیں۔ روہڑی سیمنٹ فیکٹری کے مزدوروں کے مطالبات تسلیم کیے جائیں گرفتار شدہ مزدوروں کو رہا کیا جائے اور ان کو سنائی جانے والی کوڑوں کی سزا منسوخ کی جائے۔

بقیہ : پرانی سیاست گری

نہیں ہے انتخابات میں کوئی برائی نہیں برائی اس میں ہے کہ الیکشن کے تاریخ اور ان کے تقاضوں کا احترام نہ کیا جائے یا آئین اور قانون کی خلاف ورزی کی جائے ہم نے تو یہ نہیں سنا کہ قانون کی حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں عوام کے منتخب نمائندوں کے بنائے ہوئے قانون کو منسوخ کر دیا جائے عوام کی منتخب قومی اسمبلی کو توڑ دیا جائے۔ اور عام شہری قوانین کی جگہ فوجی قوانین نافذ کر دیئے جائیں۔ یہ قانون کی حکمرانی نہیں جنگل کے قانون کی حکمرانی ہے پاکستان جیسے نظریاتی ملک میں اس طرح بار بار جنگل کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے اس ملک کے عوام ذمہ دار نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو مارشل لاء لگاتے ہیں آئین توڑتے ہیں یا اسے معطل کرتے ہیں یا اس میں من مانی ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں ایک طرف ۱۹۷۳ء کے آئین کی مخلوط انتخاب کی دفعہ کو مقدس تصور نہ کرنا اور اسے من مانے طور پر تبدیل کر کے جداگانہ انتخاب کو نافذ کر دینا اور دوسری طرف لوگوں سے یہ کہنا کہ خبردار ۷۳ء کے آئین میں شامل صوبائی خود مختاری کی دفعہ پر انتخابی مہم کے دوران بحث بھی نہ کی جائے مضحکہ خیز ور یہ نہیں تو اور کیا ہے آخر آئین میں کیا ہو اور کیا نہیں ہو اس کے تعین کا اختیار چند فوجی افسروں کو کیسے دیا جا سکتا ہے یہ فوج کے ذمہ آئین سازی کا فرض کب سے سپرد ہوا ہے اور کس نے سپرد کیا ہے؟ کیا یہ تمام باتیں خود مسلح افواج کے اپنے کوڈ کے خلاف نہیں ہیں؟ جب فوج میں ایک سپاہی یا افسر بھرتی ہوتا ہے تو اسے ایک حلف اٹھانا پڑتا ہے جس میں یہ بات واضح طور پر لکھی ہوتی ہے کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لے گا پھر ہر سروس کا الگ الگ کوڈ اور رولز ہوتے ہیں ان کے تحت بھی مسلح افواج کے کسی افسر کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ ملک کی باگ ڈور سنبھال لے منتخب حکومت کو برطرف کرے اور آئین کو ردی کی ٹوکری کے کاغذ سے زیادہ اہمیت نہ دے۔

میرے نزدیک ضرورت اس امر کی نہیں کہ فوج کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے اور اس کے لئے کسی بہانے سے آئین میں ترمیم کی جائے اور اس عمل تبسیحہ کا نام فوج کا آئینی کردار رکھا جائے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ آئین میں ایسی ترمیمات کی جائیں کہ آئندہ مسلح افواج کا کوئی افسر منتخب آئینی حکومت کو برطرف نہ کر سکے پارلیمنٹ کو نہ توڑ سکے اور آئین کو منسوخ یا معطل نہ کر سکے۔ اور اگر وہ ایسا کرے تو آئین کے تحت اُسے جو سزا دی جائے سو دی جائے سب سے پہلے مسلح افواج اس پر فوجی کوڈ اور اپنے حلف کی خلاف ورزی میں کورٹ مارشل کریں اور قرار واقعی سزا دیں اصل میں ملک کے عوام کو جس چیز کی ضمانت چاہیئے وہ یہ ہے کہ کوئی سرکاری ملازم جسے سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی ہے اور وہ سرکاری ملازم خواہ شہری ہو یا فوجی وہ آئندہ کبھی جمہوری عمل میں مداخلت نہیں کرے گا۔ سیاست میں حصہ نہیں لے گا۔ مسلح افواج اور اُس کے افسر عوام کے منتخب نمائندوں اور ان کی منتخب حکومت کے تابع ہوتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ آئین اور قانون کے مطابق عمل کریں نہ یہ کہ وہ آئین اور قانون کو اپنی خواہشات کا تابع بنا دیں اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ آئندہ منتخب حکومت مسلح افواج ان کے افسروں کے لئے ریفریشر کورس منعقد کرے اور ان کی مناسب تعلیم و تربیت کی جائے اور انہیں قانون کی حکمرانی کے صحیح مفہوم سے آگاہ کیا جائے اگر ایسا نہ کیا گیا اور جنرل ضیاء کی خواہشات کے مطابق ملک میں عوام کی منتخب کردہ قومی اسمبلی کو سرکاری ملازموں کا تابع بنا دیا گیا کہ وہ جب چاہیں اسے رکھیں اور جب چاہیں اُسے توڑ دیں تو ملک اور قوم کے لیے اس سے زیادہ تباہ کن چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی اس کے نتائج ۱۹۷۱ء کی صورتحال سے زیادہ سنگین برآمد ہوں گے ہمیں اُمید ہے کہ ملک کا کوئی جمہوریت پسند صدر ضیاء کی تجاویز کی تائید نہیں کرے گا بلکہ قوم اور ملک کے مفاد میں انہیں بلا کسی خوف و طمع کے یہ مشورہ دے گا کہ وہ خدارا غلط مشوروں کو قبول نہ کریں اور ان مشیروں سے بچیں جو ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور فوجی شکست اور سپر اندازی کے ذمہ دار تھے۔

بقیہ : غیبوں کی ڈائری

انہی دنوں تحریک استقلال کے سربراہ مسٹر اصغر خان بھی ۲۴ مارچ سے ایک دن پہلے کراچی پہنچ گئے، واضح رہے کہ اصغر خان مسٹر بھٹو کی اپیل کے بارے میں سپریم کورٹ کی طرف سے فیصلہ سنائے جانے سے کچھ دن پہلے بھی یہاں پہنچے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ "اپیل" کے فیصلے کے اعلان کے وقت انہوں نے کراچی کے اخباری نمائندوں اور اپنے قریبی حلقوں کو یہ خوشخبری سنائی

تھی کہ بھٹو کو پھانسی ہو جائے گی اور ان کا خلا وہ خود پورا کریں گے۔ بہر حال اس بار انہوں نے کم سے کم اخباری نمائندوں سے اس قسم کا رابطہ قائم نہیں کیا۔

کچھ لوگ بڑے وثوق سے ۱۷ نومبر کو انتخابات ہونے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ سب "دکھاوے" کے لئے ہے تاکہ بھٹو کا پتہ صاف کرنے کے لئے فضا کو سازگار رکھا جائے جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت نے انتخابات کرانے کے لئے باقاعدہ ایک پلان تیار کر لیا ہے اور یہ پلان "راؤ فرمان علی پلان" اور بنگلہ دیش میں کامیابی سے استعمال کئے گئے "جنرل ضیاء الرحمان فارمولا" کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے۔ کچھ حضرات نے جو انتہائی باخبر ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، ہمیں بڑے وثوق سے بتایا کہ انتخابات سے پہلے "بہت کچھ" ہونے والا ہے، ان کے مطابق بنگلہ دیش کی طرز پر ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی جائے گی جو پاکستان کی موجودہ کئی سیاسی جماعتوں کو ضم کر کے بنائی جائے گی۔ ان ذرائع کے مطابق اس پارٹی میں مسلم لیگ چٹھہ گروپ، پی ڈی پی، جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے اسلام کا سیاسی ونگ اور این ڈی پی کا ایک گروپ شامل ہوگا۔ اس فارمولے کے تحت جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے اسلام بہر حال اپنا مذہبی اور سماجی تشخص برقرار رکھیں گی۔ دوسری طرف یہ ذرائع بہت جلد این ڈی پی کے دو حصوں میں بٹ جانے کی پیش گوئی بھی کر رہے ہیں۔ ان دو گروپوں میں سے "اسلام پسند" گروپ جو مزاری، عابد زبیری اور پنجاب گروپ پر مشتمل ہوگا، مینگل، بزنجو گروپ سے الگ ہو جائے گا اور یہ نئی راہ اختیار کرے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس نئی راہ پر چلنے کے لئے مزاری گروپ کو خان عبدالولی خاں کی بھی حمایت حاصل ہوگی مگر وہ شاید خود کچھ وقت کے لئے غیر جانبدار رہیں۔ بہر حال بعد میں وہ "حالات" کا تعین ہونے کے بعد آ کر نئی سیاسی جماعت میں مل جائیں گے جہاں سے ان کو حکومت کے ایک اہم عہدے پر لایا جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جنرل صاحب آئین میں جو تبدیلیاں کرنا چاہتے ہیں ان میں صدر کے اختیارات بڑھانا، صدر کو براہ راست عوام کی طرف سے ۴ سال کے لئے منتخب کرنا اور کابینہ کو وزیر اعظم کی بجائے صدر کو جوابدہ ہونا جیسی ترامیم شامل ہوں گیں۔

بقیہ: مقبول رہنما اور کال کوٹھری

ہم اپنے پیچھے بے شمار ناقابل حل مسائل چھوڑ جائیں۔ تمہیں ایک ایسی سرحد کی حد بندی کرنی ہوگی جسے ہمارے بعد کبھی تسلیم نہ کیا جائے۔ چنانچہ ڈیورنڈ لائن کے معاہدے میں یہ شق رکھی گئی کہ افغانستان طورخم کے اس پار (صوبہ سرحد کے علاقے) میں آباد پختونوں کی فلاح و بہبود میں دلچسپی لینے کا حق رکھتا ہے۔ اس معاہدے پر ۱۲ نومبر ۱۸۹۳ء کو دستخط ہوتے پھر اس کی توسیع ۱۹۰۵ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ جب تک برطانیہ کی حکومت رہی۔ تو افغانستان خاموش رہا لیکن تقسیم ہند کے بعد اس نے ڈیورنڈ لائن کو اسی شق کے سہارے بین الاقوامی سرحد ماننے سے انکار کر دیا۔ اگر ۱۹۷۶ء میں لاہور میں طے پانے والے سمجھوتے کو تحریری معاہدے کی شکل دے دی جاتی۔ تو برطانیہ کی "آپس میں لڑاؤ" حکمت عملی ناکام ہو جاتی۔ چنانچہ برطانیہ بھی بھٹو حکومت کے خلاف صف آرا ہو گیا اور ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ امریکی سی آئی اے اور برطانوی انٹیلی جنس کو ایک دوسرے کے قریب لے آیا۔

۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو لندن میں ایک پلان بنایا گیا جس کا نام "آپریشن کوکا کولا" رکھا گیا جس کے تحت اولاً بھٹو کے دورہ کابل کو روکنا تھا اور دوم بھٹو کو حکومت سے دستبردار کروانا تھا۔ برطانوی وزارت خارجہ کے ایک افسر ہیملٹن نے اس مسئلے پر ۱۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو برطانوی وزیر اعظم کی منظوری حاصل کی۔ اور پلان "آپریشن کوکا کولا" کو عملی جامہ پہنانے کا کام شروع ہو گیا۔

پروگرام کے تحت ۱۵ افراد کے ذمہ یہ کام سونپا گیا۔ جن میں سے تین کو فوری طور پر اسلام آباد روانہ ہونا تھا باقی ۱۲ کو ۱۰ جنوری ۱۹۷۷ء تک لندن میں قیام کرنے کے بعد واشنگٹن روانہ ہونا تھا اور وہاں بیٹھ کر ضروری امداد بہم پہنچانا تھا۔ اسلام آباد میں امریکی سفیر BYRODE کو ضروری ہدایات بھیج دی گئیں تاکہ وہ اس سلسلے میں ضروری مدد بہم پہنچائے۔ اس وقت پاکستان میں ۱۴۵ امریکی اور برطانوی انٹیلی جنس کے افسران پہلے ہی سرگرم تھے انہیں بھی "آپریشن کوکا کولا" کو کامیاب بنانے کی ہدایات پہنچ چکی تھیں۔ چند وجوہات کی بنا پر تمام سرگرمیوں کے مرکز کے طور پر امریکی یا برطانوی سفارت خانوں کے بجائے مغربی یورپ کے ایک چھوٹے سے ملک کے سفارت خانے کا انتخاب کیا گیا۔ ٹیم کی سربراہی سی آئی اے کے جنوبی ایشیا کے چیف کے سپرد کی گئی۔

حسب پروگرام لندن سے تین افراد ۲۴ ستمبر کو اسلام آباد پہنچے اور راولپنڈی انٹر کونٹی نینٹل میں قیام پذیر ہو گئے۔ دوسرے روز امریکی سفارت خانے میں ایک خفیہ اجلاس ہوا جس میں ان تین افراد کے علاوہ امریکی، برطانوی اور مغربی یورپ کے ایک ملک کے سفیر اور پاکستان میں سی آئی اے کے مقامی ایجنٹ بھی شریک تھے۔ اس اجلاس میں پلان کی باریکیوں پر غور کیا گیا اور آئندہ کے لئے مناسب لائحہ عمل طے کیا گیا جس کے تحت برطانوی انٹیلی جنس کو بھٹو کے دورۂ کابل کو روکنے اور سی آئی اے کو اس کا تختہ الٹنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ لیکن ان دونوں کاموں میں انہیں پاکستانی ایجنٹوں اور چند سیاسی پارٹیوں کا تعاون درکار تھا جس کی انہیں بہر حال پوری پوری امید تھی۔

پروگرام کے تحت قبائلی علاقہ "دیر" میں بھٹو کے دورۂ کابل سے کچھ روز قبل فسادات کروانے تھے جس پر افغانی حکومت برہم ہوتی اور بھٹو کا مقررہ دورۂ کابل ملتوی ہو جاتا۔ دوسری جانب مقامی ایجنٹوں اور مقامی سیاسی پارٹیوں کی مدد سے سی آئی اے کو بھٹو کا تختہ الٹنے کا بندوبست کرنا تھا۔ پورے پروگرام "آپریشن کوکا کولا" کو تکمیل کے لئے دس ماہ کا وقت مقرر کیا گیا جس کی انہیں لندن اور واشنگٹن سے ۱۶ اکتوبر کو منظوری حاصل ہو گئی۔ تختہ الٹانے کی تاریخ بھی متعین ہوئی۔ کیونکہ روایت کے مطابق امریکی آزادی کی سالگرہ کی پارٹی کے موقع پر بھٹو کا ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو اسلام آباد میں موجود ہونا ضروری تھا۔

پروگرام پر عمل درآمد شروع ہوا۔ پاکستانی امریکی ایجنٹوں اور امریکہ نواز سیاسی پارٹیوں نے توقع سے کہیں زیادہ تعاون کیا اور ہر کام پروگرام کے عین مطابق پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ دیر میں ہنگاموں اور خونریز جھڑپوں کا آغاز ہوا۔ پلان کے مطابق بھٹو کا دورۂ کابل ملتوی ہوا۔ پروگرام اور شہنشاہ ایران کے دباؤ کے تحت الیکشن منعقد ہوئے۔ پلان کے مطابق بھٹو کے خلاف ہنگاموں کا آغاز ہوا۔ پلان کے مطابق بھٹو کا ۵ جولائی کا تختہ الٹا گیا۔ پلان کے مطابق پی این اے اور حکومت میں معاہدہ ہو جانے کے بعد اتحاد کی جنرل کونسل نے معاہدہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قصہ مختصر ہر کام نہایت "خوش اسلوبی" سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

قارئین کہتے ہیں

اور جذبات کیا ہیں اسی سلسلے میں حتی المقدور میں ان سے ملا۔ اور ان کے خیالات سے آگاہی حاصل کی کہ وہ جناب بھٹو کی پھانسی کے سلسلے میں کیا رائے رکھتے ہیں پاکستانی بھائیوں کی ایک سرگرم محفل میں جب میں نے اپنا سوال کیا تو ایک بھائی ایٹم بم کیطرح پھٹ پڑا۔ اور گویا ہوا ہم پاکستان باشندے اپنے بچوں اور ملک کی خدمت کے لئے زمانے کی چیرہ دستیوں اور نشیب و فراز کی تلخیوں کو پس پشت ڈال کے شبانہ روز محنت مشقت کرتے ہیں تاکہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے اور ملک کے لئے سود مند ثابت ہوں۔ اگر ہمارے ذہن اندیشہ ہائے دور دراز سے پاک ہوں تو ہم مزید یکسوئی اور لگن سے کام کر کے زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ کما سکتے ہیں ہم فطری طور پر خود کو وطن کے موجودہ حالات سے خود کو مبرا نہیں رکھ سکتے کیونکہ وطن سے محبت جزو ایمان ہونے کے علاوہ سب سے مقدم و افضل بھی ہے ہمیں دکھ ہے کہ وطن عزیز کے موجودہ ارباب حل و عقد کی بھونڈی سیاست اور آئے دن بدلتی ہوئی چالوں سے سمندر پار پاکستانوں کے سر غیر لوگوں کی باتیں سنکر شرم و ندامت سے جھک جاتے ہیں جس سے ہمارا جینا اور یہاں رہنا دو بھر ہو گیا ہے کبھی کبھی دل کی گہرائیوں سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ اے پروردگار! کوئی ایسا مرد مجاہد ہماری قوم میں پیدا کر جو آگے بڑھے اور ظلم و ناانصافی کے دور کا خاتمہ کر دے اے خدا! یہ کیسی اندھیر نگری ہے کہ مملکت خداداد کے مسلمہ ازلی دشمن جنہوں نے قدم قدم پر اس کے بننے میں مخالفت کی تھی۔ اور اس کی راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے تھے وہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر قوم کے نجات دہندہ بن بیٹھے ہیں انہیں کروڑوں انسانوں کی خواہش کو دبانے اور ان کے جذبات سے کھیلنے کا حق کس نے دیا ہے پاکستان ان مخالفین کی میراث بن گیا ہے منتخب نمائندوں کا محاسبہ کرنے کی بجائے یہ سیاسی یتیم خود اپنا محاسبہ اور اصلاح کیوں نہیں کرتے یہ دنیائے اسلام کے ایک عظیم مجاہد ذوالفقار علی بھٹو کی ذاتی دشمنی میں اس قدر اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں کہ اپنے گھناؤنے عزائم کی خاطر پورے ملک اور قوم کو لے کر ڈوب رہے ہیں۔

جب میں نے باقی لوگوں سے کہا کہ آپ اس بھائی کے خیالات سے متفق ہیں تو سب نے بیک زبان ہو کر کہا ہم اس کے جذبات کی تائید کرتے ہیں۔ پھر ایک دوسرا بھائی بولا کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک میں رہنے کی وجہ سے ہمیں دنیا بھر سے آئے اخبارات پڑھنے کو روزانہ میسر آتے ہیں ہم مختلف ملکوں کے ریڈیو پر خبریں سنتے ہیں اور یہاں مقامی ٹی وی پر دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کی نیوز ریلیز دیکھتے ہیں۔ الغرض دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے پیش نظر ہر پنہاں حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ کون کیا کر رہا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے چنانچہ ہم مجبور ہیں کہ کیا دنیا کے ۸۰ کروڑ فرزندانِ توحید کا اسلام پاکستان کے حکمرانوں اور مودودی صاحب کے اسلام سے مختلف ہے؟ جب کہ اب تک تمام مسلمان اپنے سربراہوں کے توسط سے یہ کہہ چکے ہیں کہ بھٹو عظیم ہے اور اس نے اسلام کی خدمت کی ہے اسے چھوڑ دو، لیکن دوسری طرف پاکستان میں چند نام نہاد اسلام کے ٹھیکدار بھٹو کی جان لینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(ملک ایم یعقوب بحرین)

سندھ کے خلاف سازش

سندھ کے ایک "قوم پرست" لیڈر جی ایم سید نے اپنی سالگرہ کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے سندھی طلباء کو ہدایت کی کہ وہ تب تک سیاست میں حصہ نہ لیں جب تک مارشل لاء حکومت ہے سندھ کی ہمیشہ یہ بدقسمتی رہی ہے کہ اسے رہزن نما رہبر ملے۔ جی ایم سید بھی انہی میں ایک ہیں جو اپنے طبقاتی اعتبار سے بزدلانہ موقع پرستانہ کردار ادا کر رہے ہیں آج جبکہ جماعت اسلامی والے بھٹو اور پیپلز پارٹی کی دشمنی کی آڑ میں سندھ کے عوام کے خلاف بھیانک سازش کر رہے ہیں سندھ کے حقوق کے نام نہاد علمبردار جی ایم سید ان سازشوں کے خلاف مزاحمت کرنے کی بجائے سندھ کے نوجوانوں کو غلط مشورے دیکر ان کے ذہنوں میں الجھنیں پیدا کر رہے ہیں جام شورو واقعہ میں پولیس کی فائرنگ سے ایک فوجی ہلاک ہو گیا حکومت اس قتل کے الزام میں بے گناہ طلباء کو ملوث کر رہی ہے پورے چھ ماہ ہو چکے ہیں سندھ یونیورسٹی ایل ایم سی سمیت چار بڑے تعلیمی ادارے بند ہیں تاحال ان کے کھلنے کی کوئی امید نہیں اس تعلیمی سال میں پورے دس ماہ سندھ یونیورسٹی بند رہی۔ ڈیڑھ ماہ جناب بھٹو کی سزا پر یونیورسٹی کو بند کر دیا گیا، اور دو ماہ زبردستی چھٹیاں کر دی گئیں اور دو اکتوبر کے بعد اب تک سندھ یونیورسٹی بند ہے تعلیمی سال فروری میں ختم ہو گیا۔ اس طرح طلباء کا پورا ایک سال ضائع ہو گیا۔ پورے ملک میں کہیں بھی ایسا نہیں ہوا ہے۔

جام شورو واقعہ کے بعد طلباء پر جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے ان سے ہر شخص واقف ہے طلباء کے خاندانوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا، تاحال کئی طلباء روپوش ہیں جنہیں حکومت نے مفرور قرار دیا ہے حد تو یہ ہے کہ ہر سال غریب طلباء کو صدارتی اسکالر شپ دیئے جاتے تھے وہ منسوخ کر دیئے گئے ہیں اور ۳۵ ہزار روپے کی رقم جو طلباء کو دی گئی تھی وہ ان سے گھروں پر نوٹس بھیج کر واپس لے لی گئی جس سے سندھ کے طلباء میں احساس محرومی پیدا ہو گیا ہے اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کو بنگال کی طرف دھکیلا جا رہا ہے جماعت اسلامی یہاں بھی ایسے ہی حالات پیدا کر رہی ہے جیسے اس نے بنگلہ دیش میں پیدا کیے تھے۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ طلباء کے خلاف انتقامی کارروائیاں بند کرے۔ تمام تعلیمی ادارے فوری طور پر کھولے، قتل کیس سمیت تمام طلباء پر قائم جھوٹے کیس واپس لے اور گرفتار شدگان کو رہا کرے۔

(سرفراز میمن صدر سندھ این ایس ایف سندھ یونیورسٹی)

اتحاد سے ایک سوال

میں نے کئی پی این اے کے لیڈروں کے یہ بیان پڑھے جن میں ان جماعتوں نے یہ تاثر دیا کہ بھٹو کے لئے رحم کی اپیل نہ کی جائے۔ میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ انسان ہیں یا حیوان ہیں یہ فیصلہ وہ خود ہی کر سکتے ہیں یا اس خط کو پڑھ کر کر سکتے ہیں۔

کیا پی این اے کے رہنماؤں کو یہ یاد نہیں کہ انہوں نے کتنے لوگ جھوٹے دلاسوں سے مروائے۔ اور وہ بھی یاد نہیں کہ کتنے غریبوں کے گھر اجڑوائے۔ ان کے علاوہ یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ملک میں کچھ نہیں ہو گا یہ بھول گئے ہیں کہ ان ماؤں اور بہنوں کے دلوں میں کیا گزری ہو گی جن کے بھائیوں کو بے گناہ ہونے کے باوجود بھی پندرہ کوڑے لگوائے کیا وہ ان لیڈروں کو معاف کریں گے کیا بھٹو مر جائے گا تو یہ چین سے بیٹھ سکیں گے۔

(اصغر علی آرائیں کنڈیارو)

غدّاری کے انعام

ہر دور میں حریت پسندوں، ترقی پسندوں عوام دوستوں کو پھانسی پر چڑھایا گیا جبکہ اس کے مقابلہ میں عوام دشمنوں، رجعت پسندوں، سامراجی ایجنٹوں، ملک دشمنوں کو انعام و اکرام ملے اور ان کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے ان واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے سراج الدولہ نے جب قوم کو بچانے اور غیر ملکی سامراج کو نکالنے کا بیڑا اٹھایا تو غیر ملکی سامراج کے ایجنٹوں اور عوام دشمنوں نے اسے پھانسی پر چڑھا دیا غدار میر جعفر کو انعام و اکرام ملا۔ ایوارڈز ملے اور اس کے خاندان کو فوج میں اعلیٰ عہدے ملے۔ میر جعفر کے خاندان کا ایک جنرل سکندر مرزا پاکستان کا حکمران بنا سلطان ٹیپو نے فرنگی کے خلاف آزادی کی جنگ کی اور اس کے مقابلہ میں فرنگی دوست جو غدار میر صادق تھے کو ایوارڈز ملے لیکن ٹیپو شہید ہو گیا۔

عوام دوست بھگت سنگھ نے سامراجی ایجنٹوں اور فرنگی کو للکارا تو فرنگی دوستوں نے اس کو پھانسی دے دی۔ اور اس کو پھانسی دینے کے صلے میں زمینوں سے نواز گیا مثلاً رضا قصوری خاندان کو اسے زمینیں ملیں اور سرکار میں اعلیٰ عہدے ملے۔ اسی طرح ٹوانہ خاندان کو مظلوم عوام پر ظلم کرنے اور مظلوم عوام کو زبردستی دوسری جنگ عظیم کا ایندھن بنانے پر بڑی بڑی جاگیریں ایوارڈز زمینیں فرنگی سے ملیں اور فوج اور پولیس میں اعلیٰ عہدے ملے تاکہ عوام پر مزید ظلم کر سکیں۔

حسین ناصر نے جب آمریت کے خلاف آواز اٹھائی تو اسے بدنام زمانہ قلعہ لاہور میں شہید کر دیا گیا اور قاتل بڑے بڑے عہدوں سے نوازے گئے۔

(علی یاسر غفاری لاہور)

وہ کافر و ظالم ہیں

قاتلوں میں اُن کا شمار ہو گا

مولانا احتشام الحق تھانوی کا مضمون

صفحہ ۱۱ پر ملاحظہ فرمائیے